مئی ۹۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

● احیائی تحریکوں میں تشدّد اور دہشت گردی کا رجح

اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا خط

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد کا خطابِ جمعہ

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

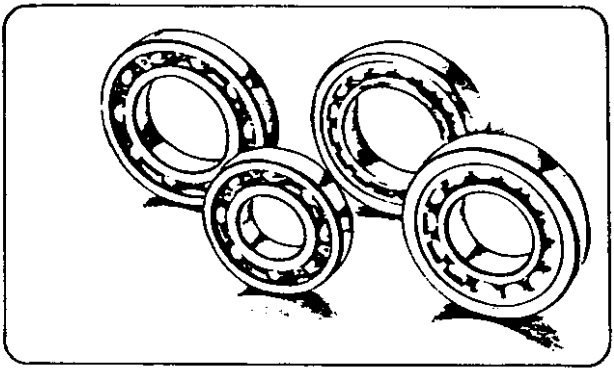

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE :
(Opening Shortly)
Amin Arcade 42,
Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA :
1-Haider Shopping Centre, Circular Road,
Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۲
شمارہ: ۵
ذوالقعدہ ۱۴۱۳ھ
مئی ۱۹۹۳ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت ۱۳۰ سعودی ریال یا ۸۰ امریکی ڈالر

یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ ۱۱۰ امریکی ڈالر

شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ۱۴۰ امریکی ڈالر

ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر ۶۰ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ——— ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ——— ۷

اسلام اور مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ:

احیائی تحریکوں میں تشدد اور دہشت گردی کا رجحان

امیر تنظیم اسلامی کا خطاب جمعہ

☆ اسلامی انقلابی جماعت یعنی "حزب اللہ" کی خصوصیات ——— ۲۵

بسلسلہ منہج انقلاب نبویؐ

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ کتابیات ——— ۳۹

چودھواں کبیرہ: حج ادا نہ کرنا

ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

☆ حسن انتخاب ——— ۴۴

اسلام اور پردہ

علامہ شبلی نعمانی

☆ توضیح و تنقیح ——— ۵۹

مکتوب گرامی حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی

اور وضاحت از امیر تنظیم اسلامی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

یکم مئی کو تحریک خلافت پاکستان کا پہلا ملک گیر کنونشن، حسب اعلان، ملتان میں منعقد ہوا۔ بحمد اللہ یہ ایک بھرپور کنونشن تھا جس میں ملک بھر سے تحریک خلافت کے معاونین جن میں تنظیم اسلامی کے رفقاء کی بھی ایک قابل ذکر تعداد شامل ہے، شریک ہوئے۔ موسم کی شدت کے باوصف حاضرین کا شوق و اشتیاق لائق رشک تھا۔ خلافت کی آواز کو ملک کے گوشے گوشے تک پہنچانے کا عزم شرکاء کے چہروں سے جھلک رہا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق شرکاء کی تعداد پونے دو ہزار کے لگ بھگ تھی۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق کنونشن کا آغاز صبح 9 بجے تلاوتِ قرآن حکیم سے ہوا۔ مرکزی خطاب داعیٔ تحریکِ خلافت و امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تھا جس سے قبل پاکستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے تحریک خلافت کے چیدہ چیدہ نمائندوں کے مختصر خطابات ہوئے۔ صوابی (مردان) سے مولانا حضرت گل، کراچی سے انجینئر نوید احمد، لاہور سے جناب سید معین الدین شاہ، دادو سے جناب علی اصغر عباسی، ملتان سے جناب سعید اظہر عاصم کے علاوہ شمس الحق اعوان صاحب، مرزا ندیم بیگ صاحب اور ناظم تحریک جناب عبدالرزاق صاحب نے بھی کنونشن سے خطاب کیا۔ کنونشن کے انتظامات کی تمامتر ذمہ داری جناب مختار حسین فاروقی صاحب کے کاندھوں پر تھی، جنہوں نے وسائل کی کمی کے باوجود جان توڑ محنت سے اس کنونشن کے انتظامات کو بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض بھی جناب فاروقی صاحب سرانجام دے رہے تھے جن کا ولولہ انگیز اسلوبِ بیان اور اشعار کا برمحل استعمال شرکاء کے دلوں کو گرمائے رکھنے اور دلچسپی برقرار رکھنے کا باعث بنا۔ داعیٔ تحریکِ خلافت نے نہایت جامعیت اور وضاحت کے ساتھ مستقبل میں عالمی خلافت کے قیام، پاکستان میں قیامِ نظامِ خلافت کے امکانات، نظامِ خلافت کے قیام کی ضرورت و اہمیت اور نظامِ خلافت کے اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ شدت کی گرمی کے باوجود داعیٔ تحریک کے کم و بیش دو گھنٹوں پر محیط خطاب کو شرکاءِ کنونشن نے نہایت دلچسپی اور دلجمعی سے سنا۔ یوں قریباً ایک بجے دوپہر کنونشن کا پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔

یکم مئی ہی کو بعد نماز عصر تحریکِ خلافت کی مرکزی کمیٹی کا انتخاب ہوا۔ انتخاب کے اس پروگرام میں ملک بھر سے تحریک کے منتخب نمائندوں نے شرکت کی۔ یاد رہے کہ پاکستان کے مختلف شہروں میں علاقائی کمیٹیوں کا انتخاب اس سے قبل عمل میں آچکا ہے اور اس کے نتیجے میں جو ارکان منتخب ہوئے ان کے ناموں کی فہرست ندائے خلافت میں شائع کی جاچکی ہے۔ علاقائی بنیادوں پر منتخب ہونے والے انہی ارکان نے مرکزی خلافت کمیٹی کے انتخاب میں حصہ لیا۔ یہ اہم مرحلہ بھی

بحمد اللہ بحسن و خوبی طے پا گیا اور اب امید ہے کہ تحریکِ خلافت کا کارواں پورے جوش و جذبے کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں ہو گا۔ اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہ

☆ ☆ ☆

قبل ازیں 23 تا 27 اپریل مرکزی انجمن کے زیر اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی کا انعقاد ہوا۔ یہ محاضرات اس اعتبار سے ہمارے لئے خصوصی اہمیت کے حامل تھے کہ ان کا موضوع تھا: "منہجِ انقلابِ نبویؐ"۔ پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ روزانہ مرکزی خطاب، جس کا دورانیہ ڈیڑھ گھنٹہ طے کیا گیا تھا، امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ہوتا تھا اور پھر اہلِ علم و دانش پر مشتمل مستفسرین حضرات کا ایک پینل موضوع سے متعلق سوالات و اشکالات پیش کرتا جس کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب جوابی وضاحت پیش فرماتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ تقریر میں اگر کوئی بات تشنہ رہ گئی ہو یا قابلِ وضاحت ہو تو موقع پر ہی اس کی وضاحت بھی ہو جائے۔ بحمد اللہ محاضراتِ قرآنی کا یہ پروگرام توقع سے بڑھ کر بھرپور اور کامیاب رہا اور اس کے ذریعے پانچ خطبات کی صورت میں انقلابِ نبویؐ کا منہاج نہایت جامعیت کے ساتھ نہ صرف یہ کہ شرکاء کے سامنے آگیا بلکہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹ میں بھی محفوظ ہو گیا۔

یہ موضوع اس پہلو سے نہایت اہم ہے کہ پورے عالمِ اسلام میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص بہت سی دینی تحریکیں بڑے خلوص اور اخلاص کے ساتھ اپنے اپنے طور پر غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجہد میں سرگرمِ عمل ہیں لیکن منہج اور طریق کار کی غلطی کے باعث نہ صرف یہ کہ محنتیں اکارت جاری ہیں بلکہ بظاہر احوال منزل روز بروز دور سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس پس منظر میں یہ بحث بہت اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ انقلابِ نبوی کا حقیقی منہج کیا تھا اور موجودہ دَور میں حالات کی تبدیلی کے باعث ہمیں اسی منہج میں کہاں اور کس قدر تبدیلی کرنی ہو گی۔ گو اس سے پہلے بھی امیر تنظیم ان موضوعات پر مفصل اظہار خیال فرما چکے ہیں اور ان کے گیارہ خطبات جمعہ پر مشتمل "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب بھی موجود ہے لیکن وہ خطابات چونکہ آج سے قریباً دس بارہ سال قبل کے ہیں اور وہاں بات بھی چونکہ بہت پھیل گئی تھی اور پھر یہ کہ اس دوران بہت سے "کرم فرماؤں" نے محترم ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ منہجِ انقلابِ نبویؐ کو جو صریحاً قرآن حکیم کی روشنی میں سیرتِ نبویؐ کے معروضی مطالعے پر مشتمل ہے، متنازعہ بنانے اور اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی چنانچہ اب ان معترضین کے پھیلائے ہوئے کانٹوں کو سمیٹنے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی تھی لہٰذا اس مرتبہ منہجِ انقلابِ نبویؐ پر امیر تنظیم کے جو پانچ خطبات ہوئے وہ اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے پہلے کے مقابلے میں وقیع تر ہیں۔ ان پانچ خطبات میں نہ صرف یہ کہ موضوع کے جملہ گوشوں کا احاطہ ہو گیا بلکہ اس کے ضمن میں اٹھائے جانے

والے سوالات اور اشکالات کی بھرپور وضاحت بھی ہو گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ محاضراتِ قرآنی ایک ایسے وقت میں ہوئے جب پورے ملک میں سیاسی افراتفری کا ایک عجیب نقشہ جما ہوا تھا۔ صدر صاحب نے اپنے اختیارات کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے قومی اسمبلی توڑ ڈالی' وزیراعظم برطرف کر دیئے گئے' پورے ملک میں احتجاجی صدائیں گونجنے سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا' نواز شریف صاحب نے صدر کے خلاف عوامی تحریک کا بڑے زوردار انداز میں آغاز کر دیا' نگران اسمبلی کی تشکیل اور قومی حکومت کے قیام کے لئے سیاسی جوڑتوڑ کا وہ سماں بندھا اور ہارس ٹریڈنگ کی وہ مثالیں قائم ہوئیں کہ الامان والحفیظ! پنجاب اسمبلی میں ارکانِ اسمبلی کی وہ باہمی جُوتم پیزار بھی اسی عرصے میں ہوئی کہ جس کے ذکر ہی سے نگاہیں شرمندگی کے مارے زمین میں گڑنے لگتی ہیں اور اس تمامتر سیاسی افراتفری اور ابتری کو اخبارات جس بلند آہنگ کے ساتھ پیش کرتے رہے کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورے ملک میں ہر سطح پر یہ افراتفری اور بدترین ہنگامہ آرائی جاری ہے اور پورا نظام ہی تلپٹ ہو کر نہیں رہ گیا' ہر خاص و عام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی تہہ و بالا ہو کر رہ گئی ہیں۔ ذہنوں کو مختل کر دینے والے اس پس منظر میں امیر تنظیم اسلامی اس ساری افراتفری' جوڑتوڑ اور ہنگامہ آرائی سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے مسلسل پانچ دن قرآن کالج کے پرسکون آڈیٹوریم میں انقلابِ نبویؐ کے مراحل و منہاج بیان کرتے رہے اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بھی نہایت ذوق و شوق اور باقاعدگی کے ساتھ امیر تنظیم کے خطبات سننے کے لئے تشریف لاتے رہے۔ اس صورت حال پر اقبال کا یہ شعر بڑی خوبصورتی سے صادق آتا ہے کہ ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش حق نے جس کو دیئے ہیں انداز خسروانہ

یہ گویا زبانِ حال سے اس امر کا اعلان تھا کہ ہمیں اگر اس ملکِ خداداد پاکستان کا مستقبل عزیز ہے تو اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم یہاں اسلامی انقلاب برپا کریں اور اسلام کے عادلانہ و منصفانہ نظام کو بالفعل رائج و نافذ کریں اور اس کے لئے اصل قابل توجہ معاملہ یہ ہے کہ ہم پورے خلوص کے ساتھ پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلامی انقلاب کا صحیح طریق کار کیا ہے اور اس کے لئے ہمیں سیرت و سنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے اور پھر اس کے لئے مقدور بھر سرگرم عمل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے' آمین۔ ان محاضرات کی قدرے مفصل اور مصور رپورٹ ان شاءاللہ "ندائے خلافت" کے آئندہ شمارے میں شامل ہو گی۔

☆ ☆ ☆

ملکی سیاسی صورت حال ہر باشعور پاکستانی کے لئے انتہائی باعثِ تشویش ہے۔ "موقع پرستی"

اور "بے اصولی" ہماری قومی سیاسی زندگی کا عنوان بن چکے ہیں۔ 23 اپریل کے خطاب جمعہ میں امیر تنظیم اسلامی نے سیاسی صورت حال کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا تھا اس کی عکاسی کے لئے درج ذیل پریس ریلیز کفایت کرے گا:

" پاکستان میں سیاسی ابتری کا آج وہی نقشہ نظر آرہا ہے جو آج سے 25-26 سال قبل 68-1967ء میں تھا جب ذوالفقار علی بھٹو غم ٹھونک کر سابق صدر ایوب خان کے مقابلے میں میدان میں آگئے تھے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ مارشل لاء نافذ ہوا بلکہ ملک بھی ٹوٹ کر دولخت ہوا اور ہمیں ہندوؤں کے ہاتھوں انتہائی ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات امیر تنظیم اسلامی پاکستان' ڈاکٹر اسرار احمد نے آج مسجد دارالسلام میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے موجودہ سیاسی صورت حال کو انتہائی بھیانک قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں دیانت' شرافت اور غیرت کا بالکل جنازہ نکل چکا ہے۔ اصول نام کی کسی شے کا ہماری ملکی سیاست میں دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ ڈھٹائی کی یہ انتہا ہے کہ چند ماہ قبل صدر اور وزیراعظم دونوں ایک دوسرے کے گن گا رہے تھے۔ صدر صاحب کا فرمانا تھا کہ موجودہ حکومت بالکل ٹھیک جارہی ہے اور چند ہی روز پہلے وزیراعظم صاحب' صدر صاحب کو آئندہ ملکی صدارت کے لئے مسلم لیگ کی جانب سے امیدوار نامزد کرکے آئے تھے' مگر آج ان دونوں میں سے ہر ایک' دوسرے کو ملک کا بدترین دشمن اور سازشی قرار دے رہا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ کل تک حکومت کے معتوب تھے اور ان کے خلاف مختلف جرائم اور ملک دشمنی کے الزامات میں عدالتی کارروائی ہو رہی تھی' آج انہیں وزارتیں سونپی جارہی ہیں!!!

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس وقت چونکہ معاملہ فوری طور پر عدالت میں آگیا ہے جو کہ یقیناً ایک صحیح قدم ہے لہٰذا نواز شریف صاحب کو اپنی سیاسی مہم میں خصوصی طور پر احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ انہوں نے اگر حالات کا مقابلے کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو انہیں اس کا حق حاصل ہے کہ اپنی سیاسی مہم جاری رکھیں مگر ملک و ملت کی خیرخواہی کا تقاضا ہے کہ وہ کسی قسم کی بھی ہنگامہ آرائی سے گریز کرتے ہوئے امن و امان کا مسئلہ پیدا نہ ہونے دیں۔ اگرچہ ایسے موقعوں پر چٹ پٹی اور اخلاق سے گری ہوئی زبان عوام میں مقبولیت کا ذریعہ بنتی ہے مگر انہیں شرافت کا دامن تھامے رہنا چاہئے تاکہ اس بحران پر خوش اسلوبی سے قابو پایا جاسکے۔ جہاں تک صدر کا تعلق ہے انہیں دستور کے مطابق نوے دن کے اندر انتخابات کرانے کی ذمہ داری ہر حال میں پوری کرنی چاہئے جو لوگ وسط جولائی کی شدید گرمی کے حوالے سے یا "پہلے احتساب" کا نعرہ لگا کر انتخابات کے التوا کی باتیں کررہے ہیں وہ ہرگز ملک و ملت کے خیرخواہ نہیں ہیں بلکہ عوام کو محض دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ احتساب کا عمل تو ہر وقت جاری رکھا جانا چاہئے الیکشن کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ ....."

اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ
احیائی تحریکوں میں تشدد اور دہشت گردی کا رجحان

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب جمعہ

جہاں تک اس مثبت بات کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلام کیسے آئے' خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام کیسے قائم ہو' تو اس سلسلے میں اس سے قبل ایک مرتبہ اسی مسجد (مسجد دارالسلام) میں مسلسل گیارہ جمعوں میں میں مفصل تقاریر کر چکا ہوں جو کتابی شکل میں "منہج انقلاب نبوی" کے نام سے موجود ہیں۔ لیکن ان گیارہ تقاریر میں بات چونکہ زیادہ پھیل گئی تھی اور ویسے بھی وہ تقاریر کئی سال پرانی ہیں لہٰذا اس سال بھی ارادہ یہ ہے کہ مرکزی انجمن کے سالانہ محاضرات میں 23 سے 27 اپریل روزانہ میں پھر اسی موضوع پر تقریریں کروں اور پانچ خطبات میں اس اہم موضوع کو سمیٹنے اور مکمل کرنے کی کوشش کروں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عظیم انقلاب کیسے برپا فرمایا' اس انقلاب کے مراحل کون کون سے تھے اور اب اگر ہم حضورؐ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلافت کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا؟ تو اسلامی انقلاب کے طریق کار کی مثبت وضاحت تو وہاں آئے گی' اس وقت مجھے اس ضمن میں ایک منفی وضاحت کرنی ہے۔

ہو سکتا ہے منفی کے لفظ سے کچھ حضرات چونک جائیں کہ منفی بات کرنا تو اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ نفی کے بعد ہی اثبات ہوتا ہے۔ کلمہ طیبہ کے الفاظ کو ذہن میں لائیے "لا الٰہ الا اللہ"۔ اس میں نفی و اثبات دونوں جمع ہیں۔ پہلے نفی ہے "لا الٰہ" پھر اثبات ہے "الا اللہ"۔ اسی حقیقت کا اظہار عربی زبان کے ایک مقولے

میں بھی ہوتا ہے کہ "تُعرَفُ الاَشیاءُ بِاَضدادِھَا" کسی شے کی اصل حقیقت' اس کی مخالف یا برعکس کیفیت کے حوالے سے زیادہ نکھرتی ہے۔ دن کی حقیقت رات کے پس منظر میں زیادہ واضح ہوتی ہے۔ اور اسی طرح رات کی حقیقت دن کے پس منظر میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے منفی اعتبار سے بات کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں۔

ہماری یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ مغربی تہذیب اور وہاں سے درآمد شدہ افکار کے زیرِاثر ہمارے سامنے نظام کی تبدیلی کے دو ہی راستے آتے ہیں۔ ایک راستہ انتخابات کا ہے اور دوسرا دہشت گردی کا۔ تیسرا کوئی راستہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ دنیا میں یہی دو طریقے ہمیں چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انتخابات کے ذریعے حکومتیں بنتی اور بگڑتی دکھائی دیتی ہیں' اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اسلام بھی اسی راستے سے آجائے گا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

چنانچہ ہمارے صوفی و ملا تمام اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد پہلا انتخاب 1951ء میں ہوا تھا۔ تو گویا گزشتہ بیالیس سال سے تمام دینی جماعتیں اسی کام میں لگی ہوئی ہیں۔ نتیجہ کیا ہے؟ پاور پالیٹکس میں مصروف یہ دینی جماعتیں کبھی کسی ایک بڑی سیکولر پارٹی کا ضمیمہ بنی ہوتی ہیں اور کبھی کسی دوسری کا۔ کبھی کسی سیکولر ذہن کے لیڈر کو کندھا دے کر اوپر پہنچادیا اور پھر پچھتائے کہ ہم نے کیوں اس کو اوپر پہنچادیا تو پھر اس کی ٹانگ گھسیٹنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ یہی آنکھ مچولی چل رہی ہے۔ اور اب تو معاملہ یہ ہوچکا ہے کہ ع "اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی"۔ عوام بھی یہ بات جان چکے ہیں کہ ان کا ہدف اور مقصود بھی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ لوگ بھی جیسے تیسے 'اقتدار کے اندر شریک بن جائیں! لیکن بدقسمتی در بدقسمتی یہ ہے کہ جب کبھی انتخابات سے ہٹ کر سوچنے کی بات ہوتی ہے تو ذہن تشدد پسندی اور دہشت گردی کی طرف جاتا ہے۔ اب تک تو یہی ہوتا آیا ہے کہ پوری دنیا میں جو بھی دینی احیائی تحریکیں ہیں ان سب نے انتخابی راستے ہی کو اختیار کیا۔ گویا۔

"ہم ہوئے' تم ہوئے' کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے"

لیکن اب ان میں ایک نیا احساس اجاگر ہو رہا ہے اور یہ اس صورت حال سے پیدا ہوا جو الجزائر میں پیش آئی۔ وہاں اسلامی عنصر کو فیصلہ کن فتح ہو رہی تھی لیکن پھر امریکہ کی منافقت کا یہ سب سے بڑا مظہر سامنے آیا کہ ویسے تو وہ ملک جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار بنتا ہے لیکن الجزائر کے اندر اسی جمہوریت کا گلا گھونٹنے میں سب سے مؤثر کردار امریکہ نے ادا کیا۔ تاہم اس وقت مجھے اس پر بحث نہیں کرنی' دشمنوں نے تو جو کچھ کرنا ہے کرنا ہی ہے۔ اس بارے میں اگر ہم کسی قسم کے حسن ظن میں مبتلا ہیں تو یہ ہماری حماقت ہے۔ لیکن اصل معاملہ یہ ہے کہ اب دینی عناصر نے الجزائر کے اندر جو راستہ اختیار کیا ہے وہ وہی دہشت گردی کا راستہ ہے۔ فوج کا ٹرک جا رہا ہے' اس پر بم پھینک دیا' چار چھ آدمی مارے گئے۔ اب اس کا ردّعمل کیا ہوگا؟ ------ حکومت کے کارندے اور فوجی اہلکار پورے علاقے کا گھیراؤ کریں گے' گھر گھر تلاشیاں لیں گے۔ اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ تلاشی کے عمل میں جب کوئی فوجی گھر میں گھستا ہے اور وہاں اسے عورتیں نظر آتی ہیں' اسے نسوانی حسن نظر آتا ہے تو وہ بھوکا بھیڑیا بن جاتا ہے۔ جنسی اعتبار سے یہ بھوکے بھیڑیئے جب گھروں میں گھستے ہیں تو وہی کچھ کرتے ہیں جو آپ سنتے آرہے ہیں۔ آج الجزائر کے اندر یہی صورت حال ہے' بیس آدمی انہوں نے ماردیئے' دس انہوں نے ماردیئے' بھٹی دہکی ہوئی ہے' صحیح خبریں ہم تک نہیں پہنچ رہیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہاں کی اسلامی تحریک نے انتخابات کا راستہ چھوڑا تو دہشت گردی پر اتر آئے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کوئی فوجی کانوائے جا رہا ہے' حریت پسندوں نے اس پر بم پھینک دیا اور دس پندرہ فوجی مارے گئے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ان کو معلوم ہے کہ بم پھینکنے والا اسی علاقے میں موجود ہے۔ لہٰذا ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ یا تو آدمی ہمارے حوالے کرو یا پوری آبادی سامنے آجائے۔ پھر وہ پوری پوری آبادیوں کا محاصرہ کر لیتے ہیں' تلاشی کے بہانے گھروں میں گھستے ہیں' عورتوں کی آبروریزی کرتے ہیں' اس طرح بدترین درندگی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اور یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ وہاں طریق کار غلط اختیار کیا گیا ہے۔ یہ تو درحقیقت اس طریق کار کا ایک فوری ردّعمل اور اس کا ایک نتیجہ ہے جو نکل کر رہے گا۔ یہی معاملہ الجزائر میں شروع ہوا اور بدقسمتی سے اس سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اب مصر میں شروع ہو چکا ہے۔

مصر میں "الجماعۃ الاسلامیہ" بڑی فعال تنظیم ہے۔ اس جماعت سے میرا قریبی تعارف آج سے تیرہ چودہ سال پہلے ہوا تھا۔ 1979ء میں جب میں پہلی مرتبہ امریکہ گیا تھا تو واپسی پر ایک ہفتے کے لئے مصر میں رکا تھا۔ اس وقت میں نے الجماعۃ الاسلامیہ کے جو نوجوان دیکھے تھے ان سے انتہائی متاثر ہو کر آیا تھا کہ ان میں ہمارے ہاں کی جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت دونوں کی خصوصیات موجود تھیں۔ برِعظیم پاک و ہند کی یہ دونوں تحریکیں یعنی جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت منفرد خصوصیات کی حامل ہیں۔ جماعت اسلامی کا فکر انقلابی تھا' اس کا انداز انقلابی اور جوش و جذبہ انقلابی تھا' جبکہ تبلیغی جماعت میں تدیّن ہے' اتباعِ سنت ہے' عبادات سے لگاؤ ہے' سنتوں کا اتباع ہے۔ کبھی خواہش ہوتی تھی کہ کاش یہ دونوں چیزیں کسی ایک جماعت میں جمع ہو جائیں۔ کچھ لوگ کہتے رہے ہیں کہ کاش مولانا الیاس اور مولانا مودودی دونوں مل کر ایک شخص بن جاتے۔ لیکن یہ محض خواہش کی بات ہوتی ہے' ایسا ہوا نہیں کرتا۔ عالمِ واقعہ میں ہر شخص کا صغریٰ کبریٰ علیحدہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہ کسی حقیقت کو بیان کرنے کا ایک انداز ہے کہ یہ ایک وصف جو ان میں ہے اور یہ ایک جو ان میں ہے' اگر یہ دونوں وصف جمع ہو جائیں تو بیڑا پار ہو جائے۔ تو ان دونوں جماعتوں کے اوصاف کی حامل جماعت "الجماعۃ الاسلامیہ" میں نے 1979ء میں دیکھی تھی۔ (واضح رہے مصر کی "جماعۃ اسلامیہ" کا جماعت اسلامی ہند و پاک سے کوئی تعلق نہیں) ان کے قائد عمر عبدالرحمٰن نابینا ہیں اور نہایت جوشیلے مقرر ہیں۔ آج کل وہ امریکہ میں مقیم ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس جماعت نے بھی اب دہشت گردی کا رخ اختیار کر لیا ہے۔ مصر میں جو غیر ملکی سیاح آتے ہیں وہ ان پر چھاپے مار رہے ہیں' ان کی بسوں پر بم پھینک رہے ہیں' جابجا دھماکے کر رہے ہیں لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ان کے مدمقابل ایک مستحکم حکومت ہے جس کی اپنی باقاعدہ فوج ہے' نیم فوجی دستے ہیں' پھر تربیت یافتہ پولیس ہے اور نامعلوم کتنی قوتیں ہیں' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی واحد سپریم پاور امریکہ ان کی پشت پر ہے۔ لہٰذا ان چیزوں کا کوئی مثبت نتیجہ تو نکل نہیں سکتا۔ افسوس اور صدمے کی بات یہ ہے کہ نہایت قیمتی خون رائیگاں جا رہا ہے' جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ وہ اپنے طور پر قربانیاں دے رہے ہیں' جامِ شہادت نوش کر رہے ہیں ------ لیکن جیسا کہ میں تفصیل سے عرض کروں گا' اسلامی

انقلاب کی طرف مثبت پیش قدمی کے اعتبار سے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طریق کار صحیح نہیں ہے۔ صحیح مقصد کے لئے صحیح طریق کار درکار ہے۔ ہر کام ہر طریقے سے نہیں کیا جاسکتا۔ ہر کام کے لئے اس کا ایک معین طریق کار ہوتا ہے۔ اگر مقصود انقلابِ نبویؐ ہے یعنی اللہ کے دین کا غلبہ جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہوا تو لازماً طریق کار بھی وہی اپنانا ہوگا جو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ آپ دوسروں کے طریقے مستعار لے کر وہ کام نہیں کرسکتے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔

اسی کا اندیشہ اب مجھے سعودی عرب میں محسوس ہو رہا ہے۔ "بنیاد پرستوں" کو شاہ فہد نے جو وارننگ دی ہے وہ آپ کے علم میں آچکی ہوگی۔ اندر خانے وہاں پر بھی پکڑ دھکڑ شروع ہوچکی ہے۔ بہت سے ائمۂ مساجد غائب ہوچکے ہیں۔ خاص طور پر افغانستان کے جہاد کے بعد کے اثرات کے نتیجے میں سعودی عرب کے نوجوانوں میں اسلامی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے' ان میں ایک نئی سوچ پروان چڑھی ہے اور ان کے اندر بڑے شدید قسم کے جذبات ابھرے ہیں۔ وہاں کے نوجوان بڑے فنڈا مینٹلسٹ اور سلفی قسم کے نوجوانوں کے طور پر ابھرے ہیں' اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں یہ بھٹی کب دہک جائے۔ اپنے حالیہ سفر حجاز سے واپسی پر میں ابو ظبی اور دوبئی وغیرہ میں ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ شیخ زید کی طرف سے بھی بڑی شدید وارننگ آئی ہے اور شیخ زید نے اپنے علماء سے بھی کہا ہے کہ ہمارے ہاں یہ جو فنڈا مینٹلسٹ عنصر پیدا ہوگیا ہے اس کی بیخ کنی میں ہمارے ساتھ تعاون کیا جائے' اس لئے کہ یہ اسلام کی غلط تعبیر کر رہے ہیں' اور اسلام کو غلط طریقے پر پیش کر رہے ہیں۔ اس بارے میں میرا دوٹوک موقف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کا صحیح فکر پیش کر رہے ہیں' لیکن جو طریق کار استعمال کر رہے ہیں وہ اگر دہشت گردی کا ہے تو اس کو صحیح نہیں کہا جائے گا۔ یہ طریق کار جہاں بھی اختیار کیا جا رہا ہے' خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں' درست نہیں ہے۔ اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔

میں ذرا اور پیچھے جانا چاہتا ہوں۔ جن حضرات کو الاخوان المسلمون کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہیں وہ اپنی یادداشت تازہ کرلیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حسن البناء شہید بہت عظیم شخصیت تھے۔ وہ نہ مفکر تھے' نہ مصنف' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فکر اور تصنیف

کے اعتبار سے تو الاخوان کو جماعت اسلامی نے غذا مہیا کی ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کی کتابیں عربی میں منتقل ہو کر وہاں پہنچیں اور سارا احیائی فکر اور اسلام کے نظام حیات کے متعلق ساری باتیں بھی یہیں سے پہنچیں' لیکن جہاں تک جذبہ اور جوش کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے وہ بہت آگے تھے۔ ویسے بھی عرب قوم کا ایک خاصہ ہے کہ ان میں جوش اور جذبہ بہت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے حسن البناء بڑے عظیم شخص تھے۔ انہوں نے اس جماعت میں اس قدر شدید جذبہ جہاد پیدا کر دیا تھا کہ جب انہیں شہید کر دیا گیا تو ان کے بعد الاخوان میں کوئی ایسا شخص آگے نہیں آسکا جو ان کے پیدا کردہ اس جوش و جذبہ کو کنٹرول کر سکے' لہٰذا الاخوان میں بہت سے گروپ بن گئے' جن میں دہشت گرد گروپ بھی تھے۔ دراصل صدر ناصر کا اقدام انہی دہشت گردوں کے خلاف تھا۔ پھر ان ہی میں سے ایک گروپ "الہجرۃ والتکفیر" کے نام سے سرگرم عمل ہوا جنہوں نے انور السادات کو بھی قتل کیا۔ اخوان کے ایک اہم رہنما سے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے' میری ملاقات 79ء میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ یہ "الہجرۃ والتکفیر" والے اخوان ہی کے لوگ ہیں' یہ سب ہمارے ہی ساتھی تھے لیکن یہ مشتعل ہو گئے ہیں اور اب یہ کسی کے کنٹرول میں نہیں ہیں۔

مجھے اندیشہ یہ ہو رہا ہے کہ شاید پاکستان میں بھی کچھ جماعتیں بہت جلد اسی رخ کو اختیار کر لیں۔ آج میں نے خاص طور پر اسی وجہ سے اس موضوع کو اختیار کیا ہے۔ اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں جب بھی انتخابات کے طریق کار سے مایوسی اور ناکامی کی بات ہوتی ہے جمعیت علمائے اسلام کلاشنکوف لہرا دیتی ہے۔ چنانچہ مولانا سمیع الحق صاحب ہوں یا مولانا فضل الرحمٰن صاحب' دونوں کلاشنکوف کی بات کرتے ہیں۔ مولانا شیرانی صاحب کی گفتگو سننے کا ایک بار اتفاق ہوا تو انہوں نے بھی کلاشنکوف ہی کی بات کی۔ گویا ان کی جانب سے اب اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے کا اندیشہ موجود ہے۔ اسی طرح جماعت اسلامی کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ ہمارا نوجوان بھی اب کنٹرول سے باہر ہو رہا ہے۔ وہ نوجوان یہ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں انتخابات کی وادی ہی میں سر پٹخنا ہے تو ہمیں افغانستان میں فوجی ٹریننگ کس غرض سے دلوائی تھی؟ ہماری یہ قوت آخر کس لئے ہے؟ اس پر مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو ابلیس کی مناجات میں علامہ نے شامل کیا ہے۔

ابلیس اللہ سے مخاطب ہو کر فریاد کرتا ہے کہ اے اللہ' یہ ابن آدم تو میرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس میں کوئی دم خم مجھے نظر نہیں آتا۔

ابنِ آدم چیست ؟ یک مشتِ خس است
مشتِ خس را یک شرار از من بس است

یہ تو محض ایک مشت بھر سوکھی گھاس ہے جسے بھسم کرنے کے لئے میری ایک چنگاری کافی ہے۔ اگلے شعر میں وہ بات آئی ہے جس کے لئے میں نے اس نظم کا حوالہ دیا۔ ابلیس کہتا ہے۔

اندریں آدم اگر جز خس نہ بود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ بود؟

اے اللہ' اگر اس آدم کے اندر سوائے سوکھی گھاس کے کچھ ہے ہی نہیں تو پھر میرے اندر اتنی آگ کیوں بھردی تھی؟ اس ابن آدم کو زیر کرنے کے لئے تو محض ایک چنگاری کافی تھی۔ کچھ اسی قسم کے احساسات جماعت اسلامی کے ان پرجوش نوجوانوں کے بھی ہیں کہ ہمیں آخر یہ ٹریننگ کاہے کے لئے دلوائی!!! حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ مجھے ان تمام دینی تحریکوں کے ساتھ دلچسپی ہے۔ جمعیت علمائے اسلام ہو یا جماعت اسلامی' میں توقع رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو اگر اس ملک سے خیر مطلوب ہے تو جلد یا بدیر وہ ان تحریکوں کو صحیح رخ پر ڈالے گا۔ دیگر دینی سیاسی جماعتوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اگر انہیں سیاست ہی کا راستہ اختیار کرنا ہے تو انہیں مسلم لیگ وغیرہ میں شامل ہو کر ملکی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ تبلیغی جماعت ہرگز کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے' تبلیغ دین کے میدان میں اس کی خدمات' جیسا کہ میں نے کہا' قابل قدر ہیں لیکن کاش کہ تبلیغی جماعت ایک قدم بڑھائے۔ امربالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کا فریضہ بھی سرانجام دے۔ خواہ ابھی کوئی اقدام نہ کرے اور دعوت و تبلیغ تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھے لیکن اپنے لوگوں کو بتائے تو سہی کہ ہمارا اصل مقصود خلافت کا نظام قائم کرنا ہے اور بالآخر ہمیں میدان میں آکر باطل کو چیلنج کرنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تبلیغی جماعت کے اکابرین آج ہی میدان میں نکل کر باطل کو چیلنج کریں بلکہ اس کا فیصلہ تو ہر تحریک خود کرتی ہے کہ کب اس کا وقت آتا ہے اور کب کوئی جماعت اقدام کے مرحلے

میں داخل ہوتی ہے لیکن لوگوں کو ذہناً تو تیار کیا جائے کہ صرف تبلیغ، تلقین، نصیحت اور وعظ ہی مقصود نہیں، آخر بدر و احد بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آئے تھے اور حنین کا معرکہ بھی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کے دوران پیش آیا تھا۔ اس مرحلے کے لئے ذہناً تیاری ہو، پیش نظر یہ ہو کہ ہمیں صرف اشخاص کو نہیں بدلنا بلکہ نظام کو بھی بدلنا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور ان دینی جماعتوں کو بھی جو اپنی تمام صلاحیتیں سیاست کے میدان میں کھپا رہی ہیں اللہ توفیق دے کہ وہ انتخابات کے راستے سے پسپائی اختیار کریں، لیکن خدا نہ کرے، خدا نہ کرے کہ تشدد پسندی کا راستہ اختیار کرلیں ع آئیں وہ یاں خدا کرے، پر نہ خدا کرے کہ یوں! ایسا نہ ہو کہ انتخابات کے چکر سے نکل کر وہ دہشت گردی کی راہ اختیار کرلیں۔ یہ معاملہ بہت خوفناک نتائج کا حامل ہوگا۔ اگرچہ میں یہ جانتا ہوں کہ یہ راستہ جہاں بھی اختیار کیا گیا ایک ردِّعمل کے طور پر ہی اختیار کیا گیا، اس لئے کہ ظاہر بات ہے کہ جب دوسرے راستے بند کردیئے جاتے ہیں تو انسان کی طبعی کمزوری ہے کہ وہ غصے اور جوش انتقام میں پھر اسی راستہ کو اختیار کرتا ہے، یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، لیکن تحریکوں کا اصل ٹیسٹ اسی میں ہوتا ہے کہ وہ مشتعل نہ ہوں۔ دشمن تو چاہے گا کہ آپ کو مشتعل کرکے میدان میں لائے اور Prematurely (قبل از وقت) آپ کو لڑنے پر آمادہ کردے۔ لیکن اصل امتحان یہیں پیش آتا ہے۔

میرے نزدیک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا کمال اور منہجِ انقلاب کے مراحل کے اعتبار سے سب سے زیادہ حیران کن پہلو یہ ہے کہ پورے بارہ برس آپؐ نے اپنے صحابہ کو جوابی کارروائی سے روکے رکھا۔ مکی دور میں حکم یہی تھا کہ "No retaliation" ماریں کھاؤ، تکالیف برداشت کرو، ہاتھ مت اٹھاؤ، خواہ تمہارے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں، کوئی پرواہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ تمہیں جان سے مار ڈالا جائے گا، مطمئن رہو جنت تمہاری منتظر ہے۔ کتنا پیارا مقام ہے وہ سورۂ یٰسین کا جب اس مردِ مومن نے اپنی قوم میں کہ جو رسولوں کی مخالف تھی، آکر اعلان کیا: "اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ" سن لو! میں تو ایمان لے آیا ہوں اپنے رب پر۔ معلوم ہوتا ہے کہ کفار اور مشرکین کے مجمعے نے مشتعل ہوکر اس اللہ کے بندے کو وہیں ختم کردیا۔ پروردگار کی

طرف سے اسے اسی وقت یہ کہہ دیا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ (قِیلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ) گویا ادھر آنکھ بند ہوئی ادھر جنت کے اندر کھل گئی۔ تب اس نے کہا: کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ کیسے میرے رب نے مجھے بخش دیا اور کیسی کچھ میری عزت افزائی کی (یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ) ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی اس کے پس ماندگان ہوں جو رو رہے ہوں کہ ہمارا باپ شہید کر دیا گیا' یا اس کی بیوہ اس صدمے میں نڈھال ہو کہ میرا شوہر شہید کر دیا گیا' لیکن وہ شخص اللہ کے دامنِ رحمت میں شاداں و فرحاں ہے۔ اسے حقیقی اور ابدی کامیابی مل چکی ہے۔ اہلِ ایمان کے لئے یہ بات انتہائی موجبِ اطمینان ہے کہ اللہ کے راستے میں ان کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں تو بھی نقصان کی بات نہیں' بلکہ اس صورت میں جنت میں داخلہ یقینی ہے۔ یہی بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یاسر اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما سے فرمائی تھی جبکہ ابوجہل ان پر بدترین تشدد کر رہا تھا اور انہیں سخت ترین ایذائیں دے رہا تھا۔ "اِصْبِرُوْا یَا اٰلَ یَاسِر فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّة" کہ اے یاسر کے گھر والو' صبر کرو! تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے۔

غور کیجئے! مسلسل بارہ برس تک مسلمانوں کو کتنی اشتعال انگیزی (Provocation) کا سامنا کرنا پڑا۔ کس کس طریقے سے انہیں ستایا گیا' کیسے کیسے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ آپ اندازہ کیجئے' مسلمان دیکھ رہے ہیں کہ ان کے ایک ساتھی' ایک بھائی بلال (رضی اللہ عنہ) کو گردن میں رسی ڈال کر اس طرح گھسیٹا جا رہا ہے جیسے جانوروں کی لاشیں گھسیٹی جاتی ہیں۔ مکے کی سنگلاخ گلیاں ہیں' نوکیلے پتھر نکلے ہوئے ہیں' جسم ادھڑ رہا ہے۔ لیکن کہا گیا صبر کرو' برداشت کرو' کوئی Retaliation نہیں' اس لئے کہ یہ کفار تو چاہتے ہیں کہ تم مشتعل ہو جاؤ' لیکن تمہیں بہرصورت اپنے آپ کو تھامنا ہے۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

ابھی صبر کرو' اپنے آپ کو تھامو' ایک وقت آئے گا کہ تمہارے ہاتھ کھول دیئے جائیں گے۔ لیکن اس مرحلے سے پہلے کہیں ناپختگی کی حالت میں (Prematurely) کوئی اقدام

نہ کر بیٹھنا۔ یہ تھا اصل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال کہ آپؐ کے جاں نثاروں نے پورے طور پر آپؐ کی اس ہدایت پر عمل کیا۔

اس وقت میرے نزدیک یہ ایک تشویشناک بات ہے کہ اس قسم کے فنڈا مینٹلسٹ نوجوانوں کی ایک بڑی کھیپ امریکہ میں تیار ہو چکی ہے کہ جو اگرچہ صحیح دینی جذبہ رکھتے ہیں لیکن اندیشہ ہے کہ وہ حالات کے دباؤ کے تحت دہشت گردی کی راہ اختیار کرلیں۔ بڑی عجیب صورت حال ہے جو میں اس مرتبہ وہاں دیکھ کر آیا ہوں۔ ہمارے کچھ نوجوان جو 1960ء کے عشرے میں طالب علموں کی شکل میں امریکہ گئے تھے اور وہیں مقیم ہو گئے ان کی اگلی نسل اب جوان ہو کر ہائی سکولوں میں پہنچی ہوئی ہے۔ اس نسل میں سے جن نوجوانوں کے اندر دین کا جذبہ ہے وہ اتنا کھرا جذبہ ہے اور ان کی سوچ اتنی صحیح ہے کہ واقعتاً وہ کیفیت مجھے یہاں نظر نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کا نظامِ تعلیم ایسا ہے کہ نوجوان کے اندر خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ آزادی وہاں کی فضا میں رچی بسی ہوئی ہے۔ وہاں کا نوجوان Question کرتا ہے' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ ان کے ہاں جو دینی جذبہ رکھنے والے نوجوان پیدا ہو چکے ہیں ان کو بھی روکنا اور سنبھالنا بڑا مشکل ہے۔ بعید نہیں کہ وہ بھی دہشت گردی کے راستے پر پڑ جائیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ وہاں ایسے نوجوانوں کے خلاف حکومتی سطح پر اقدامات ہوں گے۔ ابھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے اندر جو دھماکہ ہوا ہے اس میں انہوں نے ایک مسلمان کو ملوث کیا ہے۔ مشہور امریکی رسالے "نیوز ویک" نے تو معین طور پر کہہ دیا ہے اور گویا ساری دنیا کے اندر ڈنکا بجادیا ہے کہ یہ کسی مسلمان کا کام ہے۔ جبکہ ایک دوسرے رسالے "ٹائم" نے بالکل صحیح صحیح بات کہی کہ ابھی تو تحقیقات ہو رہی ہیں' یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ عین ممکن ہے کہ یہ دھماکہ یہودیوں نے کرایا ہو' اس لئے کہ صیہونی طاقتیں امریکہ میں مسلم فنڈا مینٹلزم کے فروغ سے بہت خائف ہیں۔ وہ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ میں بنیاد پرست مسلمانوں کے مراکز بن چکے ہیں اور یہاں سے مسلم ممالک کو مدد پہنچتی ہے۔ اس وقت فلسطین میں حماس کا جو کام ہو رہا ہے' کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے امیگرنٹ مسلمان ان کو ہر طرح سے مدد پہنچا رہے ہیں' اخلاقی بھی اور مالی بھی۔ اس اعتبار سے اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ امریکہ کی مقامی آبادی مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام کرے۔ لیکن اس کے نتیجے میں

وہاں کے مسلمانوں نے اگر دہشت گردی کی راہ اختیار کرلی تو اس کے نتائج عالمی سطح پر چلنے والی اسلامی تحریکوں کے حق میں بہت مضر اور خوفناک ہوں گے۔ میں نے اسی وجہ سے اس موضوع پر اتنا وقت لیا ہے اور اسے اتنی اہمیت دی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں آپ کے سامنے تین نکات وضاحت کے ساتھ بیان کردوں۔

پہلی بات یہ کہ دہشت گردی کے راستے سے کامیابی ناممکن ہے۔ یہ طریقہ صرف ان مقامات پر کامیاب ہوتا ہے جہاں کسی غیرملکی یلغار کے نتیجے میں قابض فوجیں (Occupation Armies) ہوں اور پھر یہ کہ ان افواج کی سپلائی لائن بھی بہت لمبی ہو کہ جسے چھاپہ مار سرگرمیوں کے ذریعے منقطع کیا جاسکتا ہو۔ لیکن ملکی فوج (نیشنل آرمی) اور نیشنل گورنمنٹ کے خلاف یہ طریقہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کی نمایاں مثال یہ ہے کہ امریکہ جیسی سپرپاور ویٹ نام میں ناکام ہوگئی! اس لئے کہ ویٹ نام میں اس کی حیثیت قابض افواج (Occupation Armies) کی تھی اور اس کی سپلائی لائن امریکہ سے ویٹ نام تک، کئی ہزار میل لمبی تھی۔ لہٰذا ویت نامیوں کے مقابلے میں وہ مات کھاگیا۔ دوسری مثال الجزائر کی ہے۔ الجزائر کے لوگوں نے فرانس کے خلاف چھاپہ مار جنگ کی اور کامیاب ہوگئے۔ وہ اس لئے کامیاب ہوئے کہ فرانس کی فوج مقامی فوج نہیں تھی، وہ قابض فوج تھی۔ اس کے لئے سپلائی لائن فرانس سے تھی۔ لہٰذا الجزائر میں فرانس کو شکست ہوئی اور تحریک کامیاب ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ یہ طریقہ اگر کامیاب ہوتا ہے تو ایسی جگہوں پر جہاں i) غیرملکی افواج قابض ہوں اور ii) اس فوج کی سپلائی لائن طویل ہو۔ قومی اور ملکی فوجوں کے خلاف یہ طریق کار کامیاب نہیں ہے۔ اسی کو نوٹ کریں، افغانستان میں روس کے مقابلے میں مجاہدین کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ باہر سے روسی آگئے جس نے مقامی آبادی کو پورے جوش کے ساتھ کھڑا کردیا۔ دوسرے یہ کہ اس وقت کی ایک سپرپاور افغانیوں کی پشت پر تھی اور مجاہدین کو بھرپور امداد مل رہی تھی۔ الجزائر کے اس وقت کے جہاد کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس وقت امریکہ پوری دنیا کی آزادی کی تحریکوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ چاہے بالفعل مدد نہ دے رہا ہو لیکن پوری دنیا کی آزادی کی تحریکوں کو اخلاقی مدد امریکہ کی طرف سے مل رہی تھی۔ خود ہندوستان کی آزادی میں امریکہ کی سپورٹ شامل تھی۔ برطانیہ پر اس نے دباؤ ڈالا کہ

ہندوستان کو آزاد کیا جائے اور یہ چیز عالمِ اسباب میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ تاہم آزادی کے لئے جو محنت اور جدوجہد یہاں ہوئی ہے وہ اپنی جگہ پر ہے' اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یقیناً اس کے بغیر تو بات آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ کوئی باہر والا آپ کے بارے میں تبھی کوئی کلمۂ خیر کہے گا جب آپ خود اپنی جانیں دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

یہ چند مثالیں وہ تھیں جن میں آزادی کی تحریکیں دہشت گردی کی راہ اختیار کر کے کامیابی سے ہمکنار ہوئیں' اب ناکامی کی مثال دے رہا ہوں۔ اس معاملے میں نمایاں مثال پی ایل او اور الفتح کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دہشت گرد سرگرمیوں میں فلسطینیوں کے یہ گروپ اتنے آگے نکلے ہیں اور انہوں نے اس معاملے میں وہ کمال دکھایا ہے کہ شاید دنیا میں اس کی کوئی دوسری مثال نہ ہو۔ ان کے مردوں نے ہی نہیں' عورتوں نے بھی بڑے بڑے کارنامے کر دکھائے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود انہیں ناکامی ہوئی۔ کیوں؟ ------ وجہ یہ ہے کہ یہودی اسرائیل میں آکر آباد ہو چکا تھا اور اب ان کا باہم جھگڑا ایک لوکل Phenomenon (مظہر) بن چکا تھا۔ اگر تو ہمارے فلسطینی بھائی اُس وقت کھڑے ہو جاتے جب یہودیوں کو دنیا کے ہر دور نزدیک کے خطے سے لالا کر یہاں آباد کیا جا رہا تھا' تب وہ کامیاب ہو سکتے تھے۔ لیکن اب تو یہودی یہاں آباد ہو چکا اور فلسطینیوں کی یہ جدوجہد اب باہر کی کسی قابض فوج کے خلاف نہیں بلکہ اندر کی ایک حکومت کے خلاف ہے ------ ان نتائج کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ ان میں ہمارے لئے بڑا سبق پنہاں ہے۔ اور ہمارے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ دہشت گردی کا یہ طریقہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں! یہ بات تفصیل سے تب آئے گی جب مثبت طور پر منہجِ انقلابِ نبوی پر گفتگو ہوگی۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس طریقے سے کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔

دوسری بات یہ کہ اس طرزِ عمل کا ایک بہت بڑا نقصان یہ پہنچے گا کہ پوری دنیا میں "بنیاد پرست اسلامی تحریکیں" اور "دہشت گردی" مترادف الفاظ بن جائیں گے' بلکہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اسلام کے دشمنوں کو اس بات کا اخلاقی جواز حاصل ہو جائے گا کہ وہ مسلمانوں کو کچل ڈالیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی جواز کا معاملہ بہت اہمیت کا حامل ہے جو کام بغیر کسی اخلاقی جواز کے کیا جائے اس کے اثرات اس کام سے بہت مختلف ہوتے

ہیں جس کا کوئی اخلاقی جواز موجود ہو۔ مکے میں جب صحابہؓ کو کفار تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے تو ان کفار کے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں تھا۔ بھئی یہ بلالؓ کو ابی ابن خلف نے کیوں مارا۔ کیا اس نے کوئی جرم کیا ہے؟ کوئی چوری کی ہے؟ کوئی اور حکم عدولی کی ہے؟ آخر اس سے وہ کون سا جرم صادر ہوا ہے کہ اس کی لاش حیوانوں کی طرح گھسیٹی جا رہی ہے؟ نہیں' اس نے کوئی جرم نہیں کیا ------ بس صرف اتنی بات ہے کہ وہ ایک اللہ کو مانتا اور اسی کا اقرار کرتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے مسلمانوں پر شدید تشدد کیا جا رہا تھا۔ حضرت خباب بن الارت کو دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹا دیا گیا' ان کا جرم بھی اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ انہوں نے اللہ کو اپنا رب تسلیم کیا تھا اور اس مشرکانہ ماحول میں کلمہ توحید بلند کیا تھا۔ آپ سوچئے کہ اس طرح کے بلاجواز تشدد کا کیا نتیجہ ہوگا' عام لوگوں میں اس کے اثرات کیا پیدا ہوں گے' ناحق ظلم اور تشدد کا نشانہ بننے والوں کے لئے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے کہ نہیں؟ صبر اور مصابرت کی یہی وہ برکات ہیں جو طریقِ نبویؐ کا فیضان ہیں۔ بد سے بدتر انسان پر بھی اس کا بھرپور اخلاقی اثر پڑے گا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ آخر ان بے گناہ لوگوں پر اتنا تشدد کیوں ہو رہا ہے' انہوں نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس کی سزا انہیں دی جا رہی ہو۔ یہ وہ بات ہے جس سے معاشرے میں موجود خاموش اکثریت کی ہمدردیاں اندر ہی اندر انقلابی تحریک کے کارکنوں کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ خاموش اکثریت اگرچہ "خاموش" رہتی ہے لیکن اندھی تو نہیں ہوتی۔ وہ دیکھتی اور سنتی تو ہے کہ معاشرے میں کیا ہو رہا ہے۔ ظالم کون ہے اور مظلوم کون! ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انقلاب کا راستہ ہموار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ع جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ! فرض کیجئے اگر حضرت بلالؓ یا کوئی اور صحابی مشتعل ہو کر دو چار آدمیوں کو مار ڈالتے تو اس کے بعد ان پر جو تشدد ہوتا تو وہ بلاجواز نہ ہوتا بلکہ کفار کو اس کے لئے اخلاقی جواز حاصل ہوتا اور اس طرح زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا۔ بغیر کسی اخلاقی جواز کے اگر تشدد کیا جائے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہوتا ہے۔ اسی معاملے کو اپنے اوپر منطبق کیجئے کہ اگر ہم نے بھی تشدد اور دہشت گردی کی راہ اختیار کر لی تو گویا اپنے مخالفین کو اخلاقی جواز فراہم کر دیا کہ اب اگر وہ ہم پر تشدد کریں گے اور تحریک کی طاقت کو کچلنے کی کوشش کریں گے تو وہ بلاجواز نہیں ہوگا۔ سوچئے' اگر آپ

نے کسی چلتی بس کے اوپر بم پھینک دیا تو آپ کو کیا معلوم اس میں کتنے بے گناہ لوگ بھی مارے گئے!! یہ طریقہ اسلام کا سکھایا ہوا طریقہ نہیں ہے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کوئی اسوہ نہیں چھوڑا' ایسی کوئی مثال ہمارے لئے قائم نہیں فرمائی! یہ چیزیں ہم نے کہاں سے اختیار کرلی ہیں!!

پھر میرے نزدیک اس سلسلے کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم ایسی متشددانہ کارروائیوں پر جہاد فی سبیل اللہ کا لیبل چسپاں کردیتے ہیں اور اس کے نام سے فنڈ اکٹھے کرتے ہیں۔ اس طرح سے جو کروڑوں روپے جمع ہوتے ہیں انہیں ہم اپنی تحریکوں اور جماعتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ میرے نزدیک جرم در جرم ہے۔ یہ اسلام کو بدنام کرنا اور جہاد فی سبیل اللہ جیسی مقدس اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔ آزادی کی جدوجہد بھی بلاشبہ جہاد ہے۔ ظاہر ہے کہ آزادی حاصل کرنا محکوم کا حق ہے۔ اسے اپنے حق کے لئے جہاد کرنا چاہئے' لیکن اسے جہادِ حریت کہا جائے گا' جہاد فی سبیل اللہ نہیں! جہاد فی سبیل اللہ کوئی اور شے ہے' اس کی شرائط کچھ اور ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ جب قتال کی صورت اختیار کرلے تو اس لئے کچھ شرطیں پوری ہونی چاہئیں۔ پہلے ایسے لوگ پیدا ہوچکے ہوں جو اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے نظر آئیں کہ خالص اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے بغیر آپ جہاد کو بدنام کردیں گے۔ پھر جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت کرکے جہاد کرنا شرط لازم ہے۔ جس طرح نماز بغیر وضو کے نہیں ہوسکتی اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ ان شرطوں کے بغیر نہیں ہوتا۔ لیکن ہم نے جہادِ حریت پر جہاد فی سبیل اللہ کا لیبل لگادیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے درحقیقت جہاد کی اسلامی اصطلاح کو بدنام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ 1950ء کے عشرے میں جہاد الجزائر چل رہا تھا۔ میں ان دنوں جماعت اسلامی منٹگمری کا امیر تھا۔ اس وقت علامہ بشیراحمد الابراہیمی الجزائری یہاں آئے تھے' کرنل عودہ ان کے ساتھ تھے۔ ہم نے بھی ان کے لئے چندے اکٹھے کئے تھے اور انہیں دیئے تھے۔ لیکن میں آج اپنی غلطی کا احساس خود کررہا ہوں کہ ہم نے ان کے جہادِ حریت کو جہاد فی سبیل اللہ سمجھا تھا۔ اس جہاد کے نتیجے میں الجزائر آزاد ہوگیا' اسے آزادی حاصل ہوگئی لیکن وہ ایک سوشلسٹ ملک بن گیا۔ الجزائر کے جہاد میں دوسرے ممالک کے مسلمان نوجوان بھی شریک ہوئے۔ الٰہ آباد (یوپی) کا ایک نوجوان جو

جوشِ جہاد میں الجزائر پہنچا' وہاں اسے گولی لگی' بیمار ہوا' زخمی ہوا' ٹی بی ہوئی' آج اپنے اقدام پر نادم ہے۔ یہ صاحب آج کل ٹورنٹو میں ہیں۔ میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات 79ء میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اس وقت روتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے الجزائر کے جہاد کے لئے اپنا خون دیا تھا اور آج شمالی افریقہ میں شراب کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ملک الجزائر ہے۔ کیا جہاد فی سبیل اللہ کے نتیجے یہ نکلتے تھے؟ اسے جہادِ حریت کہئے' خدا کے لئے جہاد فی سبیل اللہ نہ کہئے۔ ان اصطلاحات کے تقدس کو پامال نہ کریں۔ جہادِ حریت بھی یقیناً جائز ہے اور اس میں جو مسلمان جان دیتا ہے وہ بھی شہید ہے' اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **"مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ"** کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوجائے وہ بھی شہید ہے۔ حادثاتی موت اور وبائی مرض سے موت بھی شہادت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا انتڑیوں کی بیماری سے موت بھی شہادت ہے۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ میں حاصل ہونے والی شہادت اور ایسی شہادت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مسلمان کی پوری زندگی شہادت ہے اور موت بھی شہادت ہے' اسے اللہ کا گواہ بن کر زندگی گزارنی ہوتی ہے' بفحوائے الفاظِ قرآنی: **"لِتَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا"** لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' جہاد فی سبیل اللہ اور اس کے مرحلۂ قتال کی بڑی سخت شرائط ہیں۔

رہا افغانستان کا معاملہ تو اس کا میں نے کئی مرتبہ تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ اس جنگ میں پانچ قسم کے عناصر شامل تھے۔ ان میں سے دو کا جہاد خالصتاً جہاد فی سبیل اللہ تھا' لیکن جو تیسرا بڑا حصہ ہے اس کا جہاد صرف جہادِ حریت تھا اور اس کا جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر اتنا بڑا جہاد خالصتاً جہاد فی سبیل اللہ ہوتا تو آج اس کے نتائج بہت بڑے پیمانے پر نکل چکے ہوتے۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ دہشت گردی والا معاملہ اب الجزائر میں بھی شروع ہوچکا ہے اور وہاں کی اسلامی تحریک دہشت گردی کا رخ اختیار کرچکی ہے۔ یہی معاملہ مصر میں شروع ہوچکا ہے اور الجماعۃ الاسلامیہ وہ انداز شروع کرچکی ہے۔ اسی کے اندیشے سعودی عرب میں ہیں' تبھی شاہ فہد کی وارننگ آئی ہے۔ اسی کا اندیشہ عرب امارات میں ہے' تبھی شیخ زید کی وارننگ آئی ہے' یہی چیز الاخوان المسلمون کی تاریخ

سے ملتی ہے کہ انہوں نے بھی یہ راستے اختیار کرلئے تھے اور اب اسی کے اندیشے اس ملک میں بھی ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ملک کو اس طرح کے شر سے محفوظ رکھے ——— اور میرے پاس ابلاغ کا جو ذریعہ بھی موجود ہے اسے میں اس کے لئے استعمال کر رہا ہوں اور میری اس وقت کی گفتگو بھی اسی مقصد سے ہے کہ جو بھی ذمہ دار حضرات ہیں وہ ان چیزوں کو سمجھیں۔ اس کا پورا تجزیہ ان کے سامنے آجانا چاہئے۔ اس طریق کار میں نہ اسلام کے لئے خیر ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے لئے۔ خود ہمارا جو مقصد ہے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو اس کے اعتبار سے بھی اس کے مضر نتائج زیادہ ہوں گے اور اس سے خیر کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا بدل کیا ہے؟ میرے نزدیک آج کی دنیا میں اس کا بدل ایک عوامی تحریک ہے جس کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ 1915ء میں اس ملک میں حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں ریشمی رومال کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ یہ تحریک انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے لئے تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اگرچہ اس وقت جمعیت علماء ہند میں نہیں تھے لیکن وہ حضرت شیخ الہند کے بہت ہی محبوب نوجوان تھے۔ اپنی چھوٹی سی عمر میں انہوں نے الہلال اور البلاغ شروع کیا ہوا تھا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو یہ رائے دی کہ آپ حجاز تشریف لے جایئے اور (حجاز چونکہ اس وقت خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا) حجاز کے ذریعے آپ ترکی سے رابطہ کرکے وہاں سے انگریز کے خلاف مدد حاصل کریں اور ادھر سے مولانا عبیداللہ سندھی کو افغانستان بھیجئے تاکہ وہ امیر دوست محمد والی کابل کو آمادہ کریں کہ وہ ہماری مدد کرے۔ یہاں ہم انگریز کے خلاف بغاوت کردیں گے' باہر سے ہمیں مدد مل جائے گی اور اس طرح ہم آزادی حاصل کرلیں گے۔ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بات کہی تھی جو ریکارڈ پر موجود ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں نے حضرت شیخ الہندؒ کی انتہائی خوشامد کی کہ خدا کے لئے باہر نہ جایئے' زمانہ بدل گیا ہے' اب نہ کہیں ترکی اور کابل سے کوئی مدد ملے گی اور نہ ہی انگریز کے خلاف کوئی عسکری تحریک کامیاب ہوگی۔ اب دور آچکا ہے عوامی تحریک کا۔ آپ یہیں ہندوستان میں بیٹھئے اور انگریز کے خلاف عوامی تحریک شروع کیجئے۔ یہ ایک مسئلہ تھا جو اس وقت اس حلقے کے اندر بڑے شدومد سے زیر غور آیا۔ مولانا

ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے افسوس کہ حضرت شیخ الہندؒ نے میری رائے پر توجہ نہیں فرمائی اور اپنے انہی مشیروں کی رائے پر عمل کیا جنہوں نے یہ دوسرا راستہ دکھایا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ شریف حسین والیٔ مکہ نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرکے انگریز کے حوالے کردیا جس نے انہیں بحیرۂ روم کے ایک جزیرہ مالٹا میں قید رکھا۔ اسی نسبت سے ان کا نام اسیرِ مالٹا پڑ گیا۔ یہی حشر مولانا عبیداللہ سندھی کا کابل میں ہونے والا تھا لیکن وہ ذرا تیز آدمی تھے' انہیں بروقت اطلاع مل گئی اور وہ وہاں سے روس چلے گئے کیونکہ ہندوستان تو آ نہیں سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 1920ء میں شیخ الہند جب رہائی پاکر آئے تو انہوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس وقت کے حالات کی نبض پر ہاتھ ابوالکلام کا ہے' ہمارا نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے ابوالکلام کو امام الہندؒ بنانے کی تجویز پیش کی کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کرلو' ان کو اپنا امام مانو اور ان کی قیادت میں جدوجہد آگے چلاؤ۔ یہ تجویز نومبر 1920ء میں جمعیت علمائے ہند کی آل انڈیا کانفرنس میں پیش کی گئی' لیکن افسوس کہ علماء کی مخالفت کی وجہ سے وہ تجویز کامیاب نہیں ہوئی۔ ادھر شیخ الہندؒ کی زندگی کا چراغ گل ہوا ادھر ان کے شاگرد مولانا ابوالکلام آزاد کی امامت کے مخالف ہوگئے اور وہ بات ختم ہوگئی۔ اسی کے نتیجے میں مولانا ابوالکلام آزاد مایوس اور بددل ہوکر کانگرس میں شامل ہوگئے ورنہ اس سے پہلے وہ ہندوستان میں حزب اللہ جیسی جماعت کا تصور اور حکومت الٰہیہ کے قیام جیسی عظیم دعوت لے کر اٹھے تھے۔

وہی بات آج میں عرض کررہا ہوں کہ احیاءِ اسلام کے لئے کوئی دہشت گرد تحریک کامیاب نہیں ہوگی۔ اس کے لئے ایک زبردست منظم عوامی تحریک کی ضرورت ہوگی کہ کروڑوں لوگ اپنی جانیں دینے کے لئے تیار ہوجائیں۔ اس کی ایک مثال آج ہی کے زمانے میں ہمارے سامنے ایرانیوں نے پیش کردی ہے۔ انہوں نے کوئی دہشت گردی نہیں کی۔ وہ سڑکوں پر نکل آئے اور ہزاروں کی تعداد میں جانیں دے دیں۔ اور جب لوگ جانیں دینے کے لئے سڑکوں پر کھڑے ہوں تو کسی کو ان کے گھروں میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر فوج گھر گھر تلاشی لینے کے لئے کاہے کو جائے گی؟ پھر عورتوں کی عصمت دری کیونکر ہوگی؟ جانیں دینے والے تو سڑکوں پر موجود ہیں۔ یہ صورت حال اگر ہو تو اس کی کامیاب مثال ایران میں سامنے آچکی ہے' جس کے نتیجے میں وہ شہنشاہیوں کا شہنشاہ'

آریہ مہر' جس نے کے خسرو کی ڈھائی ہزار سالہ برسی منائی تھی اور وہ جو قدیم ایران کی سطوت کی بازیافت کے خواب دیکھ رہا تھا' اسے اس طرح بھاگتے بنی کہ ع "دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں!" نہتے لوگوں نے اپنی جانیں دے کر یہ کام کر کے دکھا دیا۔ اتنی بڑی مثال کے ہوتے ہوئے بھی اگر ہمارا نوجوان دوسرے رخ پر سوچے اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کرے یا کسی چھاپہ مار سرگرمی میں ملوث ہو تو اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اصل شے عوامی تحریک ہے' لیکن یہ یاد رکھئے کہ عوامی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ایک مضبوط تنظیم ناگزیر ہے جو اس تحریک کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہو اور اسے کنٹرول کر سکے' ورنہ عوامی تحریک کسی بھی رخ پر آگے نکل سکتی ہے اور اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ کنٹرول سے باہر ہو کر وہ مثبت کے بجائے منفی نتائج پیدا کر دے۔

اور جب تک یہ دونوں باتیں نہ ہوں اس اثناء میں تین کاموں پر کاربند رہنا ضروری ہے (1) امر بالمعروف و نہی عن المنکر باللسان۔ یعنی خیر اور بھلائی کی دعوت دیتے رہو' برائی سے روکتے رہو' برائی کے خلاف مظاہرے کرو' زبان اور قلم سے برائی کے خلاف جہاد کرو' اس کے خلاف اپنی ناگواری کا برملا اظہار کرو' لیکن پوری طرح سے پرامن رہو! کوئی بھی متشددانہ کارروائی اپنی ناکامی کو خود دعوت دینے کے مترادف ہوگی۔ (2) اپنے رفقاء کو تربیت دیتے رہو' اپنا Base بڑھاؤ' دین کی قوت کو بڑھاؤ اور (3) صبرِ محض اختیار کرو۔ سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیات 30 تا 35 ہمارے نصاب کا بہت اہم حصہ ہیں۔ ان آیات میں اس اعتبار سے مکمل رہنمائی موجود ہے کہ کوئی انقلابی تحریک جب تک اقدام کے مرحلے پر نہ آئے اس وقت تک اسے کیا کچھ کرنا ہے۔ پہلا مرحلہ ہے اللہ کی ربوبیت پر گہرا یقین' جیسا کہ آیت نمبر30 میں فرمایا گیا: "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ" ---- اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ کیا وہ یقین ہمیں حاصل ہو چکا ہے۔ نہیں ہوا تو پہلی کمی یہ ہے جس کی تلافی کی ہمیں فکر ہونی چاہئے۔ دوسرا مرحلہ ہے دعوت! لوگوں کو اخلاص اور خیرخواہی کے ساتھ اللہ کی طرف اور اس کے کلام کی جانب متوجہ کرنا۔ چنانچہ آیت نمبر33 میں فرمایا: "وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا" اللہ کی طرف بلاؤ' لیکن خیال رہے

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

اسلامی انقلابی جماعت' یعنی "حزب اللہ" کی خصوصیات

ڈاکٹر اسرار احمد

انقلابی نظریئے کی نشرواشاعت کے بعد کسی انقلابی جدوجہد کے لئے دوسری لازمی ضرورت ایک مضبوط اور منظم انقلابی جماعت کی ہوتی ہے ---- یا یوں کہہ لیا جائے کہ انقلابی دعوت کے عام کرنے کے بعد "انقلابی عمل" کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو ایک مضبوط اور مربوط تنظیمی سلسلے میں منسلک کیا جائے جو اس دعوت کو شعوری طور پر قبول کریں اور اس کو عملی جامہ پہنانے یا بالفاظِ دیگر انقلاب برپا کرنے کے لئے تن من دھن قربان کرنے کے لئے ذہنی اور قلبی اعتبار سے پوری طرح آمادہ ہوں۔

اس انقلابی جماعت کے دو خصائص تو از خود ظاہر و باہر ہیں' اس لئے کہ وہ اس کے ایسے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے بغیر کسی انقلابی جماعت کے وجود کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ایک یہ کہ وہ جماعت انقلابی نظریات اور تصورات کی اساس پر وجود میں آئے' اور دوسرے یہ کہ اس میں وہ لوگ شریک اور شامل ہوں جو اِن نظریات کو اس درجہ حرزِ جان بنا لیں کہ ان کا جینا اور مرنا ان ہی کے لئے ہو جائے اور انقلاب انہیں اس درجہ محبوب ہو جائے کہ اس کے لئے وہ ہر چیز کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ اعلیٰ سے اعلیٰ کیریر اور روشن سے روشن مستقبل اور جملہ علائق دنیوی' گویا بقول اقبال "یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند" الغرض دنیا کی ہر چیز' یہاں تک کہ متاعِ زیست اور نقدِ حیات کو بھی داؤ پر لگانے کے لئے پوری خوش دلی کے ساتھ آمادہ ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے "فدائین" کے بغیر نہ کوئی انقلاب آج تک وجود میں آیا ہے نہ آئندہ کبھی آ سکتا ہے۔ چنانچہ اسلامی

انقلاب کے لئے بھی ایسے "مجاہدین" لازمی ہیں جو قرآن مجید کے مبارک الفاظ: "میری نماز' اور میری قربانی' اور (اسی طرح) میرا جینا' اور میرا مرنا' سب اللہ ہی کے لئے ہیں!" (سورۃ الانعام: آیت ۱۶۲) کا زندہ نمونہ بن جائیں۔ بصورتِ دیگر محض جزوقتی یا خوش طبعی کے طور پر کئے جانے والے کاموں' اور جان و مال کی حفاظت اور علائقِ دنیوی کے پاس و لحاظ کو مقدم رکھنے والے لوگوں کے ذریعے کسی جزوی اصلاح کا کام تو ہو سکتا ہے' اور کوئی تعلیمی و اصلاحی' اور سیاسی و تبلیغی مہم تو سر کی جا سکتی ہے' پولیٹیکو سوشیو اکنامک سسٹم میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی' یعنی انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا۔

اس حقیقتِ کبریٰ کو قرآن حکیم نے سورۂ فاطر کی آیت ۱۰ میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس طور سے بیان کیا ہے کہ ہر پاکیزہ خیال اور اعلیٰ نظریے میں اوپر کی جانب اٹھنے کی استعداد اور صلاحیت تو فطری طور پر موجود ہوتی ہے لیکن اس کا بالفعل بلند اور غالب و قائم ہونا بھرپور عملی جدوجہد ہی کے ذریعے ممکن ہے جس کے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ نظریہ اور بہتر سے بہتر خیالات بھی غیر مؤثر اور بے نتیجہ رہ جاتے ہیں اور اچھے سے اچھے ارادے اور اونچے سے اونچے عزائم بھی صرف "نیک خواہشات" کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا "عملِ صالح" کے بغیر "کلمۂ طیبہ" اور "علمِ توحید" بھی فی الواقع بلند نہیں ہو سکتا بلکہ سرنگوں اور سر گشتہ رہ جاتا ہے۔

کسی انقلابی جماعت کے ان دو اجزائے ترکیبی کے علاوہ مندرجہ ذیل چار اضافی خصائص ایسے ہیں جن کے بغیر کوئی جماعت حقیقی معنی میں "انقلابی" قرار نہیں دی جا سکتی:

۱۔ اولین یہ کہ یہ جماعت بالکل "نئی" ہونی چاہئے اور اس کے ڈانڈے کسی بھی درجہ میں معاشرہ میں پہلے سے قائم کسی ادارے یا ہیئتِ تنظیمی کے ساتھ ملے ہوئے نہیں ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ ایسے تمام ادارے اور تنظیمی ہیئتیں جو اس معاشرہ میں پہلے سے قائم چلی آ رہی ہوں جس کے اجتماعی نظام کو بدلنا مقصود ہے' خواہ

اپنی جگہ کتنی ہی مضبوط اور توانا' اور منظم اور مربوط کیوں نہ نظر آئیں' انقلاب کے لئے مفید اور مؤثر نہیں' مخالف اور مضر ہوتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ادنیٰ ربط و تعلق بھی انقلابی عمل کے لئے بریک کا کام کرتا ہے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ کسی معاشرے میں پہلے سے قائم جملہ ادارے یا تو موجودالوقت نظام کے باضابطہ و باقاعدہ محافظ و مددگار ہوتے ہیں' یا کم از کم' خواہ مجبوراً ہی سہی' اس کے ساتھ ایک عرصے سے توافق اور ہم آہنگی اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ پہلی قسم کے ادارے تو بہرصورت انقلاب کے مخالف و مزاحم ہونگے ہی' دوسری قسم کے اداروں کی بھی چونکہ آبیاری اور پرورش اسی نظام کے ذریعے ہوئی ہوتی ہے' لہٰذا وہ اس میں کسی اساسی اور بنیادی تبدیلی کے لئے ذہناً اور طبعاً آمادہ نہیں ہوتے' بلکہ نہ صرف یہ کہ انقلابی نعروں کے پردے میں محض ظاہری اور سطحی تبدیلی اور اوپر کی ٹیپ ٹاپ ہی پر قناعت کر لیتے ہیں' بلکہ بسا اوقات ریڈیکل یعنی حقیقی اور بنیادی تبدیلی کی خواہاں انقلابی قوتوں کا راستہ روکنے میں مقدم الذکر کرداروں اور قوتوں کے مُمِدّ اور معاون بن جاتے ہیں!

بنابریں کوئی فوجی قائد' خواہ وہ اپنے عہدے اور اس سے وابستہ اختیارات کے اعتبار سے کتنا ہی طاقتور اور مقتدر نظر آتا ہو' مزید برآں خواہ وہ اپنے ذاتی خیالات و نظریات کے اعتبار سے کتنا ہی "انقلابی" کیوں نہ ہو' ملک میں قائم سیاسی' سماجی اور بالخصوص معاشی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ اس کی ساری قوت اور طاقت کا دارومدار فوج کی مجموعی قیادت پر ہوتا ہے' جس کی اکثریت موجودالوقت ظروف و احوال' اور پہلے سے قائم اجتماعی نظام کی آغوش میں تربیت پانے کے باعث مزاجاً اس کے ساتھ ہم آہنگی کی حامل ہوتی ہے۔

اسی طرح کوئی مذہبی "ہائر آرگی" بھی خواہ وہ کتنی ہی مربوط اور منظم کیوں نہ ہو' اور تعلیم و تربیت اور درجہ بندی کے کتنے ہی اعلیٰ معیارات کی حامل کیوں نہ ہو' معاشرے کے اجتماعی نظام بالخصوص اقتصادی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی۔

اس لئے کہ ایک تو وہ خود اسی کی "پروُردہ" ہوتی ہے اور اس کی جڑوں کو بھی پانی اسی سماجی اور اقتصادی نظام سے ملا ہوتا ہے۔ دوسرے اس کے لئے ان محدود مذہبی تصورات اور عقائد و رسومات سے بلند تر سطح پر اٹھنا ناممکن ہوتا ہے جو ایک عرصہ تک ناموافق اجتماعی نظام کے تابع رہنے کے ناتے غیر فعال اور غیر متحرک رہنے کے باعث جامد و منجمد ہی نہیں باقاعدہ متحجر(fossilized) ہو چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ محدود مذہبی تصورات اور عقائد ان کے پاؤں کی زنجیر بن کر رہ جاتے ہیں اور خواہ زبان سے وہ کتنے ہی انقلابی نعرے لگائیں' اور آفاقی نظریات کا پرچار کریں عملاً فرقہ وارانہ عقائد اور رسومات کی دلدل سے باہر نہیں نکل سکتے!

اس تلخ حقیقت کے ناقابلِ تردید شواہد ہماری اپنی حالیہ تاریخ اور آس پاس کے حالات و واقعات میں موجود ہیں' جن کا صراحت اور تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ عقل و منطق کا تقاضا بھی یہی ہے اور تاریخی اور واقعاتی شہادتیں بھی اسی کی ہیں کہ کسی "حقیقی انقلاب" کے لئے ایک ایسی "انقلابی جماعت" لازمی ہے جو بالکل نئی ہو اور خالص انقلابی نظریات کی بنیاد پر وجود میں آئی ہو اور جس کے ڈانڈے معاشرے میں پہلے سے قائم کسی بھی سماجی' انتظامی یا مذہبی ہیئتِ اجتماعی سے ہرگز نہ ملتے ہوں۔

۲۔ ایک حقیقی انقلابی جماعت کا دوسرا لازمی وصف' جو پہلے وصف ہی کا منطقی نتیجہ ہے' یہ ہے کہ اس میں کاڈرز (cadres) کی ترتیب اور درجہ بندی کا تعین بھی بالکل نیا ہونا چاہئے اور بالکلیہ اس بنیاد پر ہونا چاہئے کہ جس کارکن کی انقلابی نظریات کے ساتھ وابستگی کی گہرائی اور گیرائی جتنی زیادہ ہو' اور وہ انقلاب کے لئے "تن' من دھن" کی قربانی جتنی زیادہ اور جتنے والہانہ اور سرفروشانہ انداز میں دے رہا ہو وہ جماعت میں اسی قدر اوپر چڑھتا اور ترقی کرتا چلا جائے۔ اور اس درجہ بندی میں قطعاً کوئی عکس معاشرے میں پہلے سے موجود امتیازات یا اونچ نیچ کے معیارات کا موجود نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر بھارت کی کمیونسٹ پارٹی میں بھی برہمن اونچا اور شودر نیچا

شمار ہو تو وہ انقلابی جماعت کہلانے کی سرے سے مستحق ہی نہیں ہو سکتی ---- یہاں تو ترقی درجات کا واحد معیار "کمٹ منٹ" (commitment) کی گہرائی ہونی چاہئے جس کا خارجی ظہور انقلابی جوش و خروش (بلکہ جنون) اور زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانی کی صورت میں ہوتا ہے۔

۳۔ کسی انقلابی جماعت کی تیسری لازمی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے وابستگان میں اپنے نظریات اور مقاصد سے گہرے ذہنی و قلبی لگاؤ کے نتیجے میں ان کی دوستی اور قلبی محبت کا دائرہ رفتہ رفتہ صرف "ہم مقصد" لوگوں تک محدود ہو جاتا ہے اور وہ انہیں حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر عزیز ہو جاتے ہیں' خواہ ان کے ساتھ ان کا رنگ و خون' اور نسل و زبان کا کوئی اشتراک نہ ہو۔ اور اسی کے عکس کے طور پر ہر وہ شخص جو انقلاب کا دشمن ہو انہیں اپنا ذاتی دشمن نظر آنے لگتا ہے خواہ وہ ان کا قریبی عزیز اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ قرآن کے الفاظ میں "خواہ وہ ان کے باپ' یا بیٹے یا بھائی' یا قریبی رشتہ دار ہی ہوں!" (سورۃ المجادلہ آیت نمبر ۲۲)۔ چنانچہ "حزب اللہ" کی اسی "دو طرفہ" کیفیت کو قرآن حکیم نے سورۃ الفتح کی آخری آیت میں "اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" (کافروں پر بہت سخت' آپس میں نہایت شفیق) اور سورۃ المائدہ کی آیت ۵۴ میں "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" (اہلِ ایمان کے سامنے بالکل بچھ جانے والے' لیکن کافروں کے حق میں بہت بھاری) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور مردِ مومن کی اسی کیفیت کا نقشہ علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اور اگرچہ اب تو کمیونزم اور کمیونسٹ تحریک ماضی کی داستان بن گئی ہے تاہم اس کے عروج کے زمانے میں یہی کیفیت سچے کمیونسٹوں میں بہ تمام و کمال نظر آتی تھی کہ "کامریڈ" کا لفظ بھی زبان سے اس طرح ادا ہوتا تھا کہ جیسے وہ محبت کی چاشنی اور

اخوت کی مٹھاس میں لپٹا ہوا ہو!

۴۔ کسی انقلابی جماعت کا چوتھا اور اہم ترین وصف لازم یہ ہے کہ اس کے نظم و ضبط کو فوج کے روایتی ڈسپلن کے معیار پر پورا اترنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہر انقلابی جدوجہد اپنے طبعی اور منطقی تقاضے کے طور پر لازماً "تصادم" کو جنم دیتی ہے جس کا پہلا مرحلہ' جیسے کہ بعد میں واضح کیا جائے گا' یک طرفہ ہوتا ہے۔ یعنی انقلاب کے حامیوں اور علمبرداروں پر تو تشدد کیا جاتا ہے لیکن وہ کوئی جوابی کارروائی نہیں کرتے' بلکہ ہر زیادتی کو' خواہ وہ صرف زبانی کلامی ہو یا بالفعل جسمانی ہو' صبرو تحمل کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اپنے انقلابی پیغام کی نشرواشاعت اور اپنے حلقۂ اثر و نفوذ کی توسیع میں لگے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب مناسب قوت فراہم ہو جاتی ہے تو اقدام اور چیلنج کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے' جس کے نتیجے میں تصادم بھی دو طرفہ ہو جاتا ہے' خواہ وہ انقلابی جماعت کی جانب سے مسلح بغاوت کی شکل میں ہو' خواہ غیر مسلح مظاہروں کی صورت میں۔ بہرحال تصادم یک طرفہ ہو یا دو طرفہ ہر صورت میں انقلابی جماعت کے ڈسپلن اور نظم و ضبط کو فیصلہ کُن اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ خواہ یک طرفہ تصادم کے دور میں کچھ لوگ بے قابو ہو کر قبل از وقت مشتعل ہو جائیں اور جوابی کارروائی کا آغاز کر بیٹھیں' خواہ دو طرفہ تصادم کے دور میں مختلف لوگ یا مختلف گروہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق لائحہ عمل اختیار کر لیں' دونوں صورتوں میں سالہا سال کی مخلصانہ محنت کے ضائع ہو جانے اور برسوں کے کئے کرائے پر پانی پھرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (جس کی نمایاں ترین مثال غزوۂ احد میں سامنے آئی کہ پینتیس مسلمانوں کی جانب سے نظم کی خلاف ورزی کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ فتح عارضی طور پر شکست میں بدل گئی بلکہ اللہ اور رسولؐ کے شیر' سید الشہداء حمزہؓ ابن عبدالمطلب' اور یثرب میں قرآن کے پہلے مبلغ و معلم مصعبؓ بن عمیر سمیت ستر صحابہؓ شہید ہو گئے۔ اور کچھ عرصے کے لئے پورے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی اور مخالفین اور معاندین کے حوصلے بلند ہو گئے!

اس سلسلے میں بعض لوگوں کو یہ مغالطہ پیش آ جاتا ہے کہ مضبوط نظم کی اصل ضرورت تو اقدام اور چیلنج کے مرحلے کے شروع ہونے کے بعد ہوتی ہے' ابتدائی مراحل میں اس پر زیادہ زور دینا غیر ضروری ہے۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ' جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا' صبرِ محض کے مرحلے میں بھی نظم و ضبط کی اتنی ہی' بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے' جتنی اقدام کے مرحلے میں۔ اس لئے کہ اقدام اور دو طرفہ تصادم کے مرحلے میں تو کارکنوں کے جوش و خروش' بلکہ قصاص و انتقام کے جذبات کو "مخرج" مل جاتا ہے' لہٰذا معاملہ کسی قدر آسان ہو جاتا ہے' جبکہ صبرِ محض کے مرحلے میں ان تمام جذبات کے ضمن میں ع "اپنے سینے میں اِسے اور ذرا تھام ابھی!" پر عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے کہیں زیادہ ضبطِ نفس درکار ہے۔ اور اگر پارٹی ڈسپلن اور جماعتی نظم کمزور ہو تو کچھ لوگوں کا اس طرح جوش میں بے قابو ہو کر کوئی اقدام کر بیٹھنا جماعت اور تحریک کی قیادت کے سارے نقشہ کار اور پوری منصوبہ بندی کو تلپٹ کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔'

مزید برآں' کسی ہیئتِ تنظیمی کی نوعیت ابتداء ہی سے اس کے آخری ہدف کے مطابق ہونی ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر ابتداء سے اس کا مزاج کسی اور انداز اور رُخ پر پروان چڑھا ہو تو بعد میں کسی مرحلے پر اس کے مزاج میں اچانک کوئی تبدیلی پیدا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور کسی ڈھیلی ڈھالی تنظیم کو دفعتہً فوج کے سے ڈسپلن والی جماعت میں نہیں بدلا جا سکتا۔ اس کے لئے تو اس کے وابستگان کو شروع ہی سے "سنو اور تعمیل کرو!" کا عادی اور تسلیم و اطاعت کا خوگر بنانا ضروری ہوتا ہے' جس کے لئے بڑی سخت محنت اور مسلسل مشق ضروری ہے' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی انسان کے لئے اپنے ہی جیسے دو ہاتھ اور دو پاؤں رکھنے والے کسی دوسرے انسان کا "حکم" ماننا آسان کام نہیں ہوتا۔ اور اس کے لئے اپنی "اَنا" کی بڑی قربانی اور نفس کے بڑے ایثار کی ضرورت ہوتی ہے' جس کے لئے ع "ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے!" کے انداز میں پیہم مشق اور ریاضت ضروری ہے!

اب ان شاء اللہ آئندہ صحبت میں ہم "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ" (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہم اجمعین) پر مشتمل "حزب اللہ" کا تاریخی اور واقعاتی جائزہ اوپر کے اصولی مباحث کی روشنی میں لیں گے' تاکہ مزید واضح ہو جائے کہ اس جماعت کے خدوخال کیا تھے جس نے اب سے چودہ سو سال قبل تاریخِ انسانی کا وہ عظیم ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب برپا کیا تھا جس کی کوئی دوسری مثال نہ انبیاء اور رسولوں کی مقدس جماعت میں موجود ہے نہ دیگر انقلاباتِ عالم میں' اور جس کی عظمت اور جامعیت کو اس صدی میں مشرق کے ایم این رائے اور ایم کے گاندھی' اور مغرب کے ایچ جی ویلز اور ڈاکٹر مائیکل ہارٹ ایسے نوگوں نے سلام کیا ہے!

☆ ☆ ☆

ان اصولی مباحث کے پس منظر میں اب آیئے کہ اس "حزب اللہ" کا جائزہ بھی تاریخی اور واقعاتی انداز سے لیں جس نے آج سے چودہ سو سال قبل تاریخ انسانی کا عظیم ترین' گھمبیر ترین' اور صالح ترین انقلاب برپا کیا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھیں کہ اس "اسوۂ حسنہ" اور نمونۂ کامل کی اساس پر آئندہ جو "حزب اللہ" قائم ہو گی اس میں اور اس چودہ سو سال قبل کی حزب اللہ میں کس کس اعتبار سے مشابہت ہو گی اور کن کن پہلوؤں سے فرق و تفاوت!

۱۔ اس سے قبل یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ اسلامی انقلاب کا اساسی انقلابی نظریہ "توحید" ہے۔ اگرچہ وہ توحید نہیں جو آج صرف عقائد اور علمِ کلام کا مسئلہ بن کر رہ گئی ہے' بلکہ وہ توحید جو غیر اللہ کی حاکمیت کی جگہ انسانی خلافت' ملکیت کی بجائے امانت' اور سماجی اونچ نیچ کی جگہ کامل انسانی مساوات کا درس دینے کے ناتے عظیم ترین انقلابی قوت بن جاتی ہے۔ بقولِ اقبال ۔

زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی
اور اب کیا ہے فقط اک مسئلۂ علمِ کلام

اب اس مرحلہ پر یہ نوٹ فرمالیں کہ حزب اللہ جس جماعت المسلمین کے "فارورڈ

بلاک" کا نام تھا اس کی تنظیمی اساس توحید نہیں بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت و رسالت کی تصدیق پر قائم تھی۔ یعنی خواہ کوئی کتنا ہی خالص موحد اور متقی اور پارسا رہا ہو اگر آنحضورؐ پر ایمان نہ لایا تو جماعت المسلمین میں شامل نہ ہو سکا ـــــ اور اس کے برعکس خواہ کسی کے عقائد و نظریات اور اعمال و اخلاق کی ابھی پوری طرح تطہیر و تعمیر نہ ہو سکی ہو لیکن اگر وہ آپؐ پر ایمان لے آیا تو فی الفور مسلمان قرار پا کر جماعت المسلمین میں شمار کیا جانے لگا۔ "جماعت المسلمین" اور "حزب اللہ" کے مابین اس فرق و تفاوت کو اچھی طرح نوٹ کر لینا چاہئے۔ اس لئے کہ جماعت المسلمین میں تو ضعفاء بھی شامل تھے اور منافق بھی' جبکہ حزب اللہ بنیادی طور پر ان "فدائین" پر مشتمل تھی جو قرآن کی اصطلاح میں "**اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ**" اور ان کے علاوہ زیادہ سے زیادہ "**وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ**" کے زمرے میں آتے تھے اور جنہیں اللہ نے اپنے اور اپنے رسولؐ کے "مددگار" قرار دیا تھا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "اے ایمان کے دعویدارو! اللہ کے مددگار بنو' جیسے کہ عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے اپنے حواریوں کو پکارا تھا کہ کون ہیں میرے مددگار اللہ کی راہ میں' تو حواریوں نے جواب دیا تھا: ہم اللہ کے مددگار (حاضر) ہیں!" (سورۃ الصف آیت ۱۴)

اس "حزب اللہ" کے بارے میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے انہیں سورۃ الفتح کی آخری آیت میں "**مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ**" (اللہ کے رسول محمدؐ اور جو اِن کے ساتھ ہیں) سے تعبیر کیا ہے۔ گویا چودہ سو سال قبل کی "حزب اللہ" کی اساس اللہ کے رسولؐ کی نصرت و حمایت اور معیت و رفاقت تھی!۔ مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و رسل کی دو حیثیتیں ہوتی تھیں یعنی ایک اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے "شارع" یعنی قانون ساز ہونے کی حیثیت اور دوسری "داعی الی اللہ" یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے والے کی حیثیت۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے ختم ہونے کے نتیجے میں پہلی حیثیت اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ کر

"ختم" ہو چکی ہے ـــــ جبکہ آپؐ کے امتی "دعوت الی اللہ" کا فریضہ ان چودہ سو سالوں کے دوران بھی ادا کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی تاقیامِ قیامت ادا کرتے رہیں گے۔

بنابریں آئندہ جو "حزب اللہ" وجود میں آئے گی وہ بھی کسی "داعی الی الحق" اور اس کی پکار پر لبیک کہہ کر اس کے حامی و ناصر اور رفیق و مسفر بن جانے والوں ہی پر مشتمل ہو گی' صرف اس فرق کے ساتھ کہ بعد کے "داعی اِلی الحق" نہ معصوم ہوں گے' نہ "مامور من اللہ" ـــــ اور نہ ان پر وحی آئے گی' نہ ان کو ماننے یا نہ ماننے سے لوگوں میں اسلام اور کفر کا امتیاز قائم ہو گا!

۲۔ تن من دھن قربان کرنے کی جو مثالیں چودہ سو سال قبل کی حزب اللہ کے ارکان نے قائم کیں ان کے اجمالی تذکرے کے لئے بھی ع "دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر" کے مصداق ضخیم دفتر اور عمرِ نوحؑ درکار ہے۔ ایک جملہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنی قول کی سچی اور دُھن کی پکی' اتنی ایثار پیشہ اور وفاشعار' اور اتنی فعال اور متحرک جماعت چشمِ فلک نے نہ کبھی اس سے قبل دیکھی تھی نہ آئندہ دیکھ سکے گی۔ اور بالکل ایسے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی نہ آپؐ سے قبل پیدا ہوئی تھی نہ آئندہ کبھی پیدا ہو سکتی ہے' صحابہ کرامؓ کی سی جماعت بھی نہ کبھی ان سے پہلے وجود میں آئی تھی نہ آئندہ کبھی آسکتی ہے۔ وہ سعی وجہد کے پیکر' ایثار و قربانی کا مجسمہ اور جہاد و انفاق کی تصویرِ کامل تھے۔ ان کی دندی "امیدیں قلیل" تھیں اور "مقاصد جلیل" تھے اور وہ رزم و بزم دونوں جگہ یکساں "صاف دل و پاکباز" تھے اور ع "شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن" کے مطابق ان کی سب سے بڑی آرزو اللہ کی راہ میں شہادت کا رتبہ حاصل کرنا تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رب سے یہ سند حاصل کرلی تھی کہ وہ "ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے اللہ سے جو وعدہ بھی کیا پورا اور سچا کر دکھایا۔ چنانچہ ان میں سے بعض (اللہ کی راہ میں جان کی قربانی دے کر) اپنی نذر پوری کر چکے' اور باقی (اسی نیک انجام کے) منتظر ہیں!" (سورۃ الاحزاب: آیت ۲۳)

۳- یہ امر از خود ظاہر و باہر ہے کہ جماعت بالکل نئی تھی اور اس کی اساس کسی پہلے سے موجود نسلی و قبائلی تنظیم یا طبقاتی تقسیم مثلاً غریب اور امیر کے فرق یا آزاد اور غلام کے امتیاز پر قائم نہیں تھی۔ چنانچہ اس میں عربی بھی شامل ہوئے اور عجمی و حبشی بھی، قریشی بھی شریک ہوئے اور غیر قریشی بھی، امیر بھی آئے اور غریب بھی، آزاد بھی شریک ہوئے اور غلام بھی، مرد بھی شامل ہوئے اور عورتیں بھی، اور بوڑھے اور پختہ عمر بھی شامل ہوئے اور جوان اور نوعمر بھی ---- اور لطف یہ کہ اس حزب اللہ میں شریک ہونے کے بعد سب ۔ "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز - نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز!" کی مکمل تصویر بن گئے!

۴- اس جماعت میں کاڈرز اور درجہ بندی کا دارومدار بھی کلی طور پر یا سبقت کرنے اور پیچھے رہ جانے کی اساس پر تھا، یا جذبۂ اِنفاق اور جوشِ جہاد کے فرق و تفاوت کی بنیاد پر، چنانچہ یہ تو ضرور ہوا کہ (حضرت مسیحؑ کے الفاظ میں) "بہت سے بعد میں آنے والے، پہلے آنے والوں سے آگے نکل گئے!" لیکن اس درجہ بندی میں کوئی عکس معاشرہ میں پہلے سے موجود سماجی یا طبقاتی مراتب کا ہرگز موجود نہ تھا! یعنی جس نے نبیؐ کی پکار "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ!" پر جتنے زیادہ جوش و خروش اور جس قدر زیادہ والہانہ ووارفتگانہ انداز میں لبیک کہا وہ اتنا ہی آگے نکل گیا اور نمایاں ہو گیا، خواہ وہ عربی ہو یا حبشی اور قریش کے اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہو یا ادنیٰ سے، حتیٰ کہ غلام ہو یا آزاد! چنانچہ غرباء امراء سے آگے نکل گئے، غلام شرفاء کے، اور حبشی قریشیوں کے "سردار" بن گئے (جیسے کہ معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ کو سیدنا کہہ کر خطاب فرماتے تھے!) قریش کے چوٹی کے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے شرفاء اور سرداروں کی کمان کسی آزاد شدہ غلام یا اس کے بیٹے کو دے دی جاتی تھی (جیسے زیدؓ ابن حارثہ کی کمان میں جعفر طیارؓ بھی تھے اور خالدؓ بن ولید بھی، ---- اور مرضِ وفات کے دوران جو جیش آنحضورؐ نے تیار کر کے روانہ بھی کر دیا تھا اس کی سپہ سالاری اسامہؓ ابنِ زیدؓ کو عطا فرمائی تھی اور ان کی ماتحتی میں

مہاجرین و انصار کے سربرآوردہ لوگ شامل تھے!)

"حیثیتِ عرفی" کے اس انقلابِ عظیم کی ایک نہایت دلچسپ مثال حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں سامنے آئی کہ ایک بار ان کی محفل میں سہیلؓ بن عمرو بھی موجود تھے' جو فتح مکہ کے بعد ایمان لانے کے باعث "حزب اللہ" میں بہت پیچھے رہ گئے تھے' اسی اثناء میں کوئی بدری صحابیؓ تشریف لے آئے تو حضرت عمرؓ نے انہیں اپنے قریب بٹھایا اور سہیلؓ کو ذرا پیچھے ہٹا دیا' اسی طرح بہت سے "سابقون" آتے گئے اور حضرت سہیلؓ مسلسل پیچھے ہٹتے رہے' یہاں تک کہ بالآخر جوتیوں تک پہنچ گئے۔ اس پر انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ "کیا آپ کی مجلس میں ہمارا مقام یہی رہ گیا ہے؟" (واضح رہے کہ وہ قریش کے چوٹی کے سرداروں میں سے تھے' یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر وہی قریش کے نمائندے کی حیثیت سے آئے تھے اور انہوں نے ہی نہایت ماہرانہ اور متکبرانہ انداز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ شرائط منوائی تھیں جو ظاہری اعتبار سے مسلمانوں کے لئے توہین آمیز تھیں) ---- سہیلؓ کے اس احتجاج کے جواب میں حضرت عمرؓ نے سلطنتِ اسلامی کی سرحدوں کی جانب اشارہ کر دیا ---- گویا واضح کر دیا کہ جب ملکِ عرب میں انقلابی جدوجہد جاری تھی تم پیچھے رہ گئے تھے' اسی کا نتیجہ ہے جو آج تم نے دیکھا' تاہم ---- ابھی انقلابِ نبویؐ کا بین الاقوامی مرحلہ جاری ہے اور انقلابِ محمدیؐ کی بیرونِ ملک توسیع کے لئے سرحدوں پر جہاد و قتال کا معرکہ گرم ہے' لہٰذا اب بھی موقع ہے کہ وہاں جا کر جہاد و قتال فی سبیل اللہ میں جانفشانی اور سرفروشی کے ذریعے اپنی "حیثیت عرفی" کو کسی قدر بحال کرنے کی کوشش کر سکتے ہو! بصورتِ دیگر مزید پیچھے ہٹتے چلے جاؤ گے۔

۵ - اسی طرح چودہ سو برس قبل کی حزب اللہ میں ایک جانب **الحُبُّ لِلّٰہِ** نے قومی و قبائلی اور نسلی و لسانی جملہ امتیازات کو معدوم کر کے رکھ دیا تھا' اور نسلی عداوتوں اور خاندانی دشمنیوں کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا' تو دوسری جانب **"والبُغضُ**

فِی اللّٰہِ" کی تلوار نے نسلی اور خونی رشتوں تک کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں عتبہ ابنِ ربیعہ نے مبارزت کا نعرہ بلند کیا تو اس کے جواب میں اس کے حقیقی فرزند حضرت حذیفہؓ تڑپ کر نکلے (یہ دوسری بات ہے کہ رحمتِ عالمؐ نے روک دیا) اسی طرح جب عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ نے جو غزوۂ بدر تک ایمان نہیں لائے تھے اور بدر میں لشکرِ کفار میں شامل تھے اسلام لانے کے بعد ایک موقع پر اپنے والد حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ "ابا جان! آپ بدر میں کئی مرتبہ میری زد پر آ گئے تھے لیکن میں نے آپ کا لحاظ کیا تھا" تو اس کے جواب میں صدیق اکبرؓ نے فرمایا: "یہ اس لئے ہوا کہ تم کفر کے لئے جنگ کر رہے تھے' خدا کی قسم اگر کہیں تم میری زد پر آ جاتے تو میں ہرگز لحاظ نہ کرتا!"

اس معاملے میں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ یہ معاملہ اُس وقت تو اس بنا پر واضح تھا کہ ایک جانب اسلام تھا اور دوسری جانب کفر---- اس لئے کہ مدنی دور میں خود نام نہاد مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو قانونی اعتبار سے تو "جماعت المسلمین" میں شامل تھے' لیکن کفار سے دوستی رکھنے کے باعث "یہ بھی حزب الشیطان میں شامل ہیں" کے قرآنی فتوے کی زد میں آ گئے تھے۔ (سورۃ المجادلہ: آیت ۱۹) ---- لہٰذا اب بھی حالات میں کوئی معنوی اور حقیقی فرق واقع نہیں ہوا---- اور آج بھی "حزب اللہ" کے لئے عملی طریقِ کار یہی لازم ہو گا کہ "جماعت المسلمین" میں شامل جملہ مسلمانوں کے شریعت کے مطابق حقوق ادا کرتے ہوئے' اپنی اصل محبتِ قلبی اور تعلقِ خاطر کو صرف ان لوگوں کے دائرے میں محدود کر دیں جو اسلامی انقلاب کے لئے عملاً کوشاں ہوں اور اس کے لئے جانی و مالی ایثار کر رہے ہوں۔ بصورتِ دیگر نہ وہ "حزب اللہ" کے لئے کوالیفائی کر سکیں گے نہ ہی اسلامی انقلاب کی کٹھن منزل کے سر ہونے کا کوئی امکان پیدا ہو گا۔

۶۔ آخری لیکن اہم ترین معاملہ ڈسپلن اور نظم کی پابندی کا ہے۔ اس ضمن میں چودہ سو سال قبل کی حزب اللہ کی صورت تو یہ تھی کہ داعی اور امیر' اور سپہ سالار اور سربراہِ مملکت کی جملہ حیثیتیں اس مقدس ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں

جمع تھیں جو نبی اور رسول تھے' اور مہبطِ وحی اور معصوم ہونے کی بنا پر ہر وقت' ہر حال' اور ہر حیثیت میں مطاعِ مطلق تھے' چنانچہ آپؐ کی اطاعت کی جو کیفیت اہلِ ایمان سے مطلوب تھی' اور جس پر ان کے ایمان کے اثبات یا نفی کا دارومدار تھا' وہ مندرجہ ذیل دو آیتوں سے واضح ہو جاتی ہے:

(i) "کسی مومن مرد یا عورت کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کوئی معاملہ طے کر دیں تو اس کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو کسی اختیار یا انتخاب کا حقدار سمجھیں۔" (سورۃ الاحزاب' آیت ۳۶)

(ii) "اے نبیؐ آپ کے رب کی قسم' یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے تمام اختلافات اور نزاعات میں آپؐ ہی کو آخری فیصلے کا مختار اور مجاز نہ سمجھیں' اور پھر جو فیصلہ بھی آپؐ دے دیں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں' بلکہ اسے (پوری خوشدلی کے ساتھ) ایسے تسلیم کریں جیسے تسلیم کرنے کا حق ہے!" (سورۃ النساء آیت ۶۵)

لہٰذا نبیؐ کی دعوت کی اساس پر وجود میں آنے والی "حزب اللہ" کے نظم کی پابندی اور ڈسپلن کی پختگی کے لئے کسی اضافی عہد و پیمان یا قول و قرار کی ضرورت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ہر انسان جونہی آپؐ پر ایمان لانے کا اعلان کرتا تھا گویا آپ کی کلی اطاعت کا اقرار بھی کر لیتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے باضابطہ اور باقاعدہ سمع و طاعت کی بیعت لی!

اس سے دو ہی نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں ---- یعنی (i) یہ کہ سمع و طاعت کی اہمیت کو مزید اجاگر اور واضح کرنا مقصود تھا ——— اور (ii) یہ کہ یہ درحقیقت آپؐ کے بعد قائم ہونے والی کسی بھی حزب اللہ کے لئے مستقل ہدایت و رہنمائی تھی کہ آئندہ کوئی نبی یا رسول تو نہیں آئے گا جس پر "ایمان" لایا جائے' البتہ داعیٔ حق اور خادمِ دین اٹھتے رہیں گے جن سے "بیعتِ سمع و طاعت" کا رشتہ استوار کر کے حزب اللہ کی تاسیس کی جا سکے گی!

چودہواں کبیرہ

حج ادا نہ کرنا

مؤلف: ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

اسلام کے پانچ معروف ارکان میں سے آخری رکن حج ہے۔[1] حج جہاں ایک طرف اسلام کا بہت بڑا اور اہم رکن ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ کام اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی نعمت وسعادت بھی ہے، کیونکہ حج ادا کر لینے کے بعد انسان کو دُنیوی و اُخروی دونوں اعتبار سے متعدد فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات سے یہ بات بہت عیاں ہے، آپ نے فرمایا:

تَابِعُوا بَيْنَ الحَجِّ والعُمْرَةِ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الذُّنُوبَ وَالفَقْرَ كَمَا يَنْفِي الكِيرُ خَبَثَ الحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالفِضَّةِ وَلَيْسَ لِحَجَّةٍ مَبْرُورَةٍ ثَوَابٌ إِلَّا الجَنَّةَ۔[2]

"پے در پے حج اور عمرے کا اہتمام کیا کرو، کیونکہ یہ دونوں نیک کام گناہوں اور غربت کو اس طرح ختم کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کی میل کچیل کو ختم کر دیتی ہے۔ حج مبرور (یعنی مقبول حج) کا ثواب جنت سے کم نہیں۔"

اللہ تعالیٰ کی تقدیر یا حکمت کے موجب اگر کسی انسان کو یہ دنیاوی فائدہ نہ بھی ملے تب بھی حجِ مبرور اس کی اُخروی فلاح وکامیابی کی ضمانت ہے، بشرطیکہ:

---

[1] "بُنِيَ الإسلامُ علی خمسٍ" والی حدیث مکمل الفاظ، ترجمہ اور تخریج کے ساتھ متعدد بار گزر چکی ہے۔

[2] سنن الترمذی، کتاب الحج، باب ماجاء فی ثواب الحج والعمرۃ۔ سنن النسائی، کتاب الحج، باب فضل المتابعۃ بین الحج والعمرۃ۔ الشیخ ناصر الدین الالبانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح الجامع حدیث ۲۹۰۱۔

۱۔ حج اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کیا جائے۔

۲۔ دورانِ حج لڑائی جھگڑے سے ہر طرح پرہیز کیا جائے۔

۳۔ گالی گلوچ حتیٰ کہ سخت سست بات کہنے سے بھی اپنے آپ کو مقدور بھر بچایا جائے۔

۴۔ حج پر آنے والے کا ذریعۂ معاش حلال و جائز ہو۔ اس کے بعد وہ حاجی اِن شاء اللہ العزیز حقوق اللہ[1] سے متعلق تمام گناہوں اور خطاؤں سے پاک ہو جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ۔[2]

"جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے حج کیا، پھر نہ شہوانی فعل کیا اور نہ ہی کوئی بدعملی کی، وہ (گناہوں سے پاک صاف ہو کر) اس طرح لوٹا جیسے آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہو۔"

حج کا مقام و مرتبہ تو یقیناً اپنی جگہ مسلّم ہے، عمرہ بھی اجر و ثواب کے اعتبار سے کسی عظیم نعمت سے کم نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْعُمْرَةُ اِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُور

---

[1] اسلام نے حقوق کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ سے متعلق چھوٹی چھوٹی سی لغزشیں یعنی گناہِ صغیرہ بعض نیکیوں کے طفیل معاف ہو جاتی ہیں۔ اور بڑے گناہ توبہ کرنے اور حج کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں۔ البتہ حقوق العباد صرف اس شکل میں معاف ہو سکتے ہیں کہ یا تو متعلقہ فرد کی حق رسی کر دی جائے اور یا پھر وہ معاف کر دے۔ حج ایک ایسا منفرد عمل ہے جس کی وجہ سے تمام چھوٹے بڑے گناہ جو حقوق اللہ سے متعلق ہوں سب کے سب معاف ہو جاتے ہیں۔ مزید تفصیلات اسی کتاب کی جلد ۲ کے آخر میں "حقیقت و شرائط توبہ" کے عنوان سے ذکر کی جائیں گی۔ اِن شاء اللہ العزیز۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب وجوب العمرة وفضلها۔
صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرة۔

لَيْسَ لَهٗ جَزَآءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ[1]

"ایک عمرہ دوسرے عمرے تک درمیانی وقفے کے لیے کفارہ ہے۔ اور حج مقبول کا ثواب جنت سے کم کسی طرح نہیں۔"

جب حج کی اس قدر اہمیت و فضیلت ہے تو پھر بھی اگر کوئی مسلمان مادی وسائل اور فراغت رکھنے کے باوجود اس کا اہتمام نہ کرے تو یقیناً وہ بدنصیب انسان ہے جس پیرائے میں اور جس اسلوبِ بیان میں اللہ تعالیٰ نے حج کا حکم دیا ہے وہ خود قابلِ توجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ[2]

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے، اس کو خیر و برکت دے دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنا دیا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کا مقامِ عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہو گیا امن پا گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی کفر کی راہ اختیار کرے (یعنی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے) تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

آیتِ کریمہ اور اس کے ترجمے پر ذرا غور فرمائیں۔ دو خط کشیدہ جملے بالخصوص توجہ کے قابل ہیں:

"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے . . . ." اور "جو کوئی کفر کی راہ اختیار کرے . . . . ."

---

[1] (حوالہ سابقہ)

[2] سورت آلِ عمران، آیت ۹۷۔

اور اس دوسرے جملے کا اختتام ایک دھمکی کے سے انداز میں کیا جارہا ہے کہ اگر تم حج نہ کروگے تو اللہ کا کیا بگڑے گا وہ تو سارے جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ البتہ سارے کا سارا نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ اسی آیت کریمہ کی تفسیر کے ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں کو یہودی اور عیسائی قرار دیا ہے۔ فرمایا:

مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ حَجَّ بَيْتِ اللهِ الحَرَامِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا او نَصْرَانِيًّا وَ ذٰلِكَ لِأَنَّ اللهَ تَعَالٰى يَقُولُ، وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔[1]

"جس آدمی کے پاس زادِ راہ ہے اور ایسی سواری بھی ہے جو اسے بیت اللہ الحرام کے حج تک پہنچا سکے، اس کے باوجود اس نے حج نہیں کیا، پھر ایسے آدمی کے بارے میں کوئی تشویش نہیں خواہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی یعنی عیسائی ہو کر مرجائے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔"

یعنی لوگوں کے ذمے اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔"

اگرچہ حدیث سند کے اعتبار سے کمزور ہے لیکن سابقہ آیت کریمہ کے آخری جملے کو ساتھ ملا کر پڑھا جائے اور مفہوم حدیث پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث معنوی اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ اور بالخصوص حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے درج ذیل قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو معنوی اعتبار سے حدیث کے صحیح ہونے میں شک ہی نہیں رہتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] سنن الترمذی، کتاب الحج، باب ما جاء فی التغلیظ فی ترک الحج۔
السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الحج، باب امکان الحج، بروایت ابوامامہ الفاظ خاصے مختلف ہیں۔ تاہم مفہوم قریب قریب یہی ہے۔ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔

لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَبْعَثَ رِجَالاً اِلَى هٰذِهِ الْاَمْصَارِ فَيَنْظُروا كُلَّ مَنْ
لَهٗ جِدَةٌ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَضْرِبُوا عَلَيْهِمُ الْجِزْيَةَ وَمَا هُمْ بِمُسْلِمِيْنَ۔[1]

"میں نے پختہ عزم کرلیا ہے کہ میں مختلف شہروں میں سرکاری نمائندے ارسال کروں وہ جائزہ لیں کہ جو مسلمان استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتا اس پر جزیہ مقرر کردیں۔ ایسے لوگ مسلمان نہیں ہیں۔"

حاصل بحث یہ کہ حج انسان کو گناہوں سے اس طرح پاک صاف کردیتا ہے جس طرح نومولود بچہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والے کا ایمان ہی سرے سے خطرے میں ہے، کجا یہ کہ اس کی دیگر عبادتیں قبول ہوں۔

---

[1] سنن سعید بن منصور، بحوالہ تفسیر ابن کثیر، سورت آل عمران آیت ۹۷ کی تفسیر میں۔
سنن البیہقی، کتاب الحج، باب امکان الحج۔ اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن معنی قریب قریب یہی ہے۔
سند قابل اعتماد ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ
(الحج۔ آیت ۳۷)
اللہ تک تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا مگر تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔
قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ!
عیدالاضحیٰ کے مبارک موقع پر قربانی کے ساتھ
قربانی کی رُوح اور مقاصد کو سمجھنے کے لیے
امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف
عیدُالاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی
کا مطالعہ ضرور کیجئے
• سفید کاغذ • رنگین سرورق • ۴۸ صفحات • قیمت -/۶ روپے
مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶-K ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴
قریبی بک سٹال سے خریدیئے یا ہم سے منگوائیے!

اسلام اور پردہ

"برصغیر پر برطانوی حکومت کے سیاسی تسلط کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ یہاں کے مسلمان سیاسی غلامی میں گرفتار ہوئے اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی کا دور بھی شروع ہوا جس میں زیادہ تر امرا اور تعلیم یافتہ طبقات مبتلا ہوئے، چنانچہ اسی کے زیر اثر ستر و حجاب کے احکام بھی پامال ہونے شروع ہوئے۔ مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے ۱۹۱۲ء میں اس مسئلہ پر جو مبسوط مقالہ لکھا تھا وہ افادہ عام کے لیے پیش ہے۔" (ادارہ)

یورپ کی عامیانہ تقلید نے ملک میں جو نئے مباحث پیدا کر دیئے ہیں، ان میں ایک یہ مسئلہ بھی ہے۔ اگر اس مسئلہ پر صرف عقلی پہلو سے بحث کی جاتی تو ہم کو دخل در معقولات کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ خود مذہب اسلام میں پردہ کا حکم نہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرون اولیٰ میں پردہ کا رواج بھی نہ تھا۔ نئے تعلیم یافتہ گروہ کے سب سے مشہور اور مستند مصنف[1] (مولوی امیر علی) نے ۱۸۹۹ء میں رسالہ "نائنٹتھ سینچری" میں مسلمان عورتوں کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ لمبا برقع، نقاب اور خمار سلجوقیوں کے آخری زمانہ میں شائع ہوا۔ اور جس قسم کا پردہ آج کل مسلمانان ہند میں رائج ہے، خلفاء کے زمانہ میں اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا بلکہ برعکس اس کے اعلیٰ طبقہ کی عورتیں بلا برقع کے مردوں کے سامنے آتی تھیں۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں جب خلفاء ضعیف ہوئے اور تاتاریوں نے اسلامی حکومت کو درہم برہم کیا تو اس وقت علماء میں اس پر نزاع ہوئی کہ عورتیں اپنے ہاتھ، منہ اور پاؤں اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہیں یا نہیں۔"

---

[1] بے علم جسٹس امیر علی کو معلوم نہیں تھا کہ فقہ اور حدیث اس زمانے سے پہلے مکمل ہو چکے تھے اور یہ سب مسائل احادیث میں موجود ہیں۔ جہالت کی حد ہو گئی ہے۔

اس موقع پر عبرت کے قابل یہ امر ہے کہ اسلام کی تاریخ اور اسلام کے مسائل کی تعبیر کرنے والے دو گروہ ہو سکتے تھے۔ علماء قدیم اور جدید تعلیمیافتہ علماء کا یہ حال ہے کہ ان کو زمانہ کی موجودہ زبان میں بولنا نہیں آتا، جدید تعلیمیافتہ لوگوں کے مبلغ علم کا اس عبارت سے اندازہ ہو سکتا ہے جو ابھی اوپر گزر چکی ہے لیکن بدقسمتی سے یہی دوسرا گروہ قومی لٹریچر پر قبضہ کرتا جاتا ہے اور چونکہ غیر قوموں کے کانوں میں صرف اسی گروہ کی آواز پہونچتی ہے، اس لئے مسائل اور تاریخ اسلام کے متعلق آئندہ زمانے میں اسی گروہ کی آواز اسلام کی آواز سمجھی جائے گی۔ ہم اس مضمون میں صرف تاریخی پہلو سے بحث کرتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ عرب میں اسلام سے پہلے پردہ کی کیا حالت تھی۔ پھر تمام اسلامی دنیا میں پردہ کے متعلق کیا طریق عمل رہا؟

مدت ہوئی، ہم نے اس مضمون کے پہلے حصے پر ایک بسیط مضمون لکھا تھا۔ پہلے اس کو بعینہٖ اس مقام پر درج کرتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت نے مرد اور عورت کو بعض خصوصیتوں میں ایک دوسرے سے ممتاز پیدا کیا ہے۔ لیکن تمدن نے ان قدرتی خصوصیتوں کے علاوہ اور بھی بہت سے امتیاز قائم کر دیئے ہیں۔ جو ہر قوم، ہر فرقہ، ہر ملک میں جدا جدا صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ دنیا کے نہایت ابتدائی زمانہ میں غالباً مردوں اور عورتوں کے لباس، وضع، طور طریقے بالکل یکساں رہے ہونگے اور بجز قدرتی خصوصیتوں کے کوئی چیز ان کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکتی ہوگی۔ لیکن تمدن کو جس قدر وسعت ہوتی گئی، اسی قدر یہ باہمی امتیازات بڑھتے گئے۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہونچی کہ آج دونوں کے طریق تمدن اور معاشرت میں بہت کم چیزیں باقی رہ گئیں جو مشترک کہی جا سکتی ہیں۔

دنیا کی ابتدائی تاریخ بالکل تاریکی کی حالت میں ہے، قدیم سے قدیم زمانہ جس کے تاریخی حالات معلوم ہو سکتے ہیں، دو تین ہزار برس سے زیادہ نہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب موجودہ تفرقوں کی بنیاد پڑ چکی تھی اور دونوں فریق کے اصول زندگی میں بہت سی ممتاز خصوصیتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس لئے آج یہ پتہ لگانا قریباً ناممکن ہے کہ اول کن اسباب سے یہ تفرقے قائم ہوئے اور جس زمانہ کو ہم اپنے علم تاریخ کی ابتداء قرار دیتے ہیں۔ اسوقت تک کیونکر ان تفرقوں نے وسعت حاصل کر لی تھی۔

اگر ہم یہ بتانا چاہیں کہ انسان کو ستر عورت کا خیال کیونکر ہوا اور مردوں اور عورتوں میں اس کے مختلف حدود کس بنا پر قرار دیئے گئے تو ہم کوئی کافی وجہ نہیں بتا سکیں گے۔ اسی طرح اور خصوصیتوں کی نسبت بھی ہم کچھ جواب نہیں دے سکتے۔ اس لئے نہایت قدیم تفرقوں کی تاریخ قائم کرنی اور ان کے وجوہ و اسباب پر غور کرنا تو بے فائدہ ہے۔ البتہ جو امور زمانۂ مابعد میں پیدا ہوئے، ان کے متعلق تحقیقات کی کوشش کرنی بیجا نہیں ہے۔

پردہ کی دو قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں:

(۱) چہرہ اور تمام اعضاء کا ڈھکنا

(۲) مردوں کی مجلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا

پہلی قسم کا پردہ عرب میں اسلام سے پہلے موجود تھا اور زیادہ تر قدرتی ضرورتیں اس کے ایجاد کا باعث تھیں۔ اوّل اوّل جب اس رسم کی ابتداء ہوئی تو عورتوں کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ کیونکہ زیادہ تر اس کو قدرتی ضرورتوں نے پیدا کیا تھا اور وہ مرد اور عورت سے یکساں متعلق تھیں۔ غالباً سب سے پہلے قبیلۂ حمیر میں جو یمن کے رہنے والے اور وہاں کے حاکم تھے، یہ طریقہ جاری ہوا۔ اسپین میں حمیر کے ایک خاندان کی حکومت قائم ہو گئی تھی جو ملثمین کہلاتے تھے۔ اس خاندان نے نہایت زور اور قوت کے ساتھ حکومت کی اور بہت سی فتوحات حاصل کیں لیکن چہرہ پر ہمیشہ نقاب ڈالے رہتے تھے اور اس وجہ سے ملثمین کہلاتے تھے۔ اس میں یوسف بن تاشفین بڑی ہیبت و جبروت کا بادشاہ ہوا۔ علامہ ابن خلکان نے اسی کے ترجمہ میں اس رسم کے قائم ہونے کی وجہ لکھی ہے۔

وسبب ذالك على ما قيل ان حمير كانت تتلثم لشدة الحر والبرد. تفعله الخواص منهم فكثر ذالك حتى تفعله عامتهم	"یعنی اس کا سبب جیسا کہ کہا گیا ہے، یہ ہے کہ قبیلہ حمیر کے لوگ گرمی اور سردی کی وجہ سے چہروں پر نقاب ڈالے رہتے تھے پہلے خواص ایسا کرتے تھے پھر اس کو اس قدر ترقی ہوئی کہ تمام قبیلہ میں اس کا رواج ہو گیا۔

علامہ موصوف نے ایک اور سبب بھی لکھا ہے۔ وہ یہ کہ قبیلہ حمیر کی مخالف ایک قوم تھی جس کا معمول تھا کہ جب حمیر والے کسی ضرورت سے باہر جاتے تھے تو یہ لوگ ان کے گھروں پر حملہ کرتے تھے اور عورتوں کو گرفتار کر کے لے جاتے تھے۔ مجبور ہو کر اہل حمیر نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک دفعہ عورتیں مردانہ لباس پہن کر باہر چلی گئیں اور مرد چہروں پر نقاب ڈال کر گھروں میں رہے۔ دشمنوں نے معمول کے موافق حملہ کیا۔ یہ لوگ نقاب ڈالے ہوئے نکلے اور نہایت دلیری سے لڑ کر دشمنوں کو قتل کر ڈالا۔ چونکہ یہ فتح نقاب کے پردہ میں نصیب ہوئی اس لئے یادگار کے طور پر یہ رسم قائم کر لی گئی۔ یہاں تک کہ اسلام کے بعد بھی اس قبیلہ کے مرد اور عورتیں یکساں نقاب پوش رہتے تھے۔ ایک شاعر نے لکھا ہے:

لما حووا احراز کل فضیلۃ   غلب الحیاء علیہم فتلثموا

بعض اور اتفاقی امور سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ مثلاً جو لوگ حسین اور خوشرو ہوتے تھے، اس خیال سے کہ نظر بد سے محفوظ رہیں، چہرہ پر نقاب ڈال کر باہر نکلا کرتے تھے۔ اس کی مثالیں زمانہ اسلام میں بھی ملتی ہیں۔

مقنع کندی جو دولت بنو امیہ کا مشہور شاعر ہے، اسی خیال سے ہمیشہ نقاب ڈال کر باہر نکلتا تھا[1]۔ رفتہ رفتہ یہ طریقہ زیادہ تر مروج ہو گیا اور بڑے مجمعوں میں اکثر لوگ برقع پہن کر شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ بازار عکاظ میں جو عرب کی حوصلہ افزائیوں کا مشہور دنگل تھا اہل عرب عموماً چہروں پر نقاب ڈال کر آتے تھے۔ علامہ احمد ابن ابی یعقوب، جو نہایت قدیم زمانے کا مؤرخ ہے، اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

وکانت العرب تحضر سوق عکاظ	"یعنی اہل عرب عکاظ کے بازار میں آتے
وعلی وجوھھا البراقع فیقال	تھے اور ان کے چہروں پر برقعے پڑے
ان اول عربی کشف قناعہ ظریف	ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اول جس
بن غنم العنبری ففعلت العرب	عربی نے برقع اتارا وہ ظریف بن غنم
مثل فعلہ	تھا۔ اس کے بعد اوروں نے بھی اس
	کی تقلید کی۔"

---

[1] کتاب الاغانی، ترجمہ مقنع کندی

گو بعض وقتوں میں خاص اسباب اس طریقہ کے اختیار کرنے کے باعث ہوئے، لیکن اصل میں جس چیز نے اس طریقہ کی بنیاد قائم کی تھی، وہ دو امر تھے:۔

(۱) جسمانی حفاظت جس کا ذکر حمیر کے ذکر میں آچکا ہے۔ حمیر میں تو عام و خاص سب اس طریقہ کو برتنے لگے تھے۔ لیکن اور قبائل میں یہ طریقہ امراء اور اعیان کے ساتھ مخصوص تھا۔ کیونکہ اس قسم کے تکلف اور آرام طلبی کی خواہش صرف امیروں کو ہی ہو سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ ضرورت کی قید اٹھ گئی اور صرف اس خیال سے کہ نقاب اور برقع امراء کا امتیازی لباس ہے بے وجہ اور بے ضرورت بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔

(۲) امتیاز اور خصوصیت کا خیال۔ یہ خیال عجیب تدریج کے ساتھ قائم ہوا۔ اہل عرب محض ابتدائی زمانہ میں تو امیر و غریب سب ایک سی حالت میں رہتے تھے لیکن جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی گئی اسی نسبت سے امتیازات قائم ہوتے گئے۔ ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ امراء اور سرداران قوم کے دربار عام نہ ہونے چاہئیں۔ چنانچہ جاہلیت ہی کے زمانے میں دربان اور حاجب کے عہدے قائم ہو چکے تھے۔ اور سلاطین اور سرداران قبائل کے دروازوں پر اس قسم کی روک ٹوک ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ خیال یہاں تک بڑھا کہ بادشاہ دربار میں بھی بیٹھے تو اس کے جمال کی دولت عام نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بعض سلاطین عرب صرف اسی خیال سے برقع کا استعمال کرتے تھے۔

عباسیوں کی خلافت میں ایک زمانہ تک یہ جو طریقہ تھا کہ خلیفۂ وقت ایک پردہ کی اوٹ میں بیٹھتا تھا اور تمام شاہی احکام پردہ کی اوٹ سے صادر ہوتے تھے۔ اس میں اسی خیال کا پرتو پایا جاتا ہے۔

جس زمانہ میں اس طریقہ کی ابتداء ہوئی، اس وقت تو عورتیں اس رسم کے ساتھ مخصوص نہ تھیں لیکن مردوں سے یہ التزام مالایلزم نبھ نہ سکا۔ چنانچہ جب عکاظ میں ظریف بن غنم نے چہرہ سے نقاب ہٹائی تو تمام عرب اس کے مقلد بن کر اس قید سے آزاد ہو گئے کبھی کبھی کسی نے شوقیہ یا فخر کے لحاظ سے استعمال کیا تو وہ رواج عام کے خلاف سمجھا گیا۔ البتہ عورتوں میں یہ رسم اسلام کے زمانہ تک باقی رہی جس کو اسلام نے اور بھی باقاعدہ اور لازمی کر دیا۔ جس شخص نے عرب جاہلیت کے حالات غور سے پڑھے ہیں، وہ تو اس سے

انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن عام خیال چونکہ یہ ہے کہ پردہ کا رواج اسلام کے زمانہ سے ہوا اس لئے ہم متعدد قطعی شہادتیں پیش کرتے ہیں، جن سے ثابت ہوگا کہ اس قسم کا پردہ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا۔

عرب جاہلیت کے حالات معلوم کرنے کے لئے سب سے عمدہ اور مستند ذریعہ شعراء جاہلیت کے اشعار ہیں۔ اس لئے اس دعوے کے ثبوت میں ہم جاہلیت کے متعدد اشعار نقل کرتے ہیں:

ربیع بن زیاد عبسی جو جاہلیت کا ایک مشہور شاعر ہے، مالک بن زہیر کے مرثیہ میں کہتا ہے:

من کان مسرورا بمقتل مالک　　فلیأت نسوتنا بوجہ نہار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوا ہے، وہ ہماری عورتوں کو دن میں آکے دیکھے۔

یجد النساء حواسرا یندبنہ　　یلطمن اوجھھن بالاسحار

وہ دیکھے گا عورتیں، برہنہ سر نوحہ کر رہی ہیں اور اپنے چہروں کو صبح دوپہر مار رہی ہیں۔

قد کن یخبأن الوجوہ تسترا　　فالیوم حین برزن للنظار

وہ شرم اور ناموس سے ہمیشہ اپنا چہرہ چھپایا کرتی تھیں لیکن آج غیر معمولی طور پر دیکھنے والوں کے سامنے بے پردہ آئی ہیں۔

علامہ تبریزی نے تَسَتُّرًا کی شرح میں لکھا ہے عفۃً وحیاءً یعنی وہ عفت اور شرم کی وجہ سے چہرہ چھپایا کرتی تھیں۔

عمرو بن معدیکرب ایک سخت واقعہ جنگ کے ذکر میں لکھتا ہے

وبدت لمیس کانھا !!　　بدر السماء اذا تبدی

اور لمیس کا چہرہ کھل گیا گویا چاند نکل آیا۔

عمرو بن معدیکرب، اگرچہ مخضرمی شاعر ہے یعنی اس نے اسلام کا زمانہ بھی پایا تھا لیکن یہ اشعار اسلام کے قبل کے ہیں۔

ایک اور جاہلی شاعر جس کا نام سبرۃ بن عمر فقعسی ہے، اپنے دشمنوں پر طعن کرتا ہے اور کہتا ہے:

ونسوتکم فی الروع باد وجوھھا　　یخلن اماءً والاماء حرائرُ

یعنی لڑائی میں تمہاری عورتوں کے چہرے کھل گئے تھے اور اس وجہ سے وہ لونڈیاں معلوم ہوتی تھیں حالانکہ وہ آزاد تھیں۔

نابغہ ذبیانی جو زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر ہے، نعمان بن منذر کا بڑا مقرب اور درباری تھا، ایک دفعہ نعمان کی ملاقات کو گیا۔ اتفاق سے وہاں نعمان کی بیوی جس کا نام متجردہ تھا بیٹھی تھی۔ نابغہ دفعتہً جا کھڑا ہوا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اضطراب میں دوپٹہ گر گیا۔ متجردہ نے فوراً ہاتھوں سے چہرہ کو چھپا لیا۔ نابغہ کو یہ ادا نہایت پسند آئی، اس پر اس نے ایک قصیدہ لکھا جس میں اس واقعہ کو اس طرح ذکر کیا ہے۔

سقط النصیف ولم ترد اسقاطه فتناولته واتقتنا بالید

دوپٹہ گر گیا اور اس نے قصداً نہیں گرایا۔ اس نے دوپٹہ کو سنبھالا اور ہاتھوں سے پردہ کیا۔

ایک اور شاعر عوف نامی یہ ذکر کر کے کہ بھوک کی شدت سے عورتیں نکل آئیں اور باہر جہاں کھانا پک رہا تھا، چولہے کے پاس بیٹھ گئیں، لکھتا ہے:

وکانوا قعودا حولها یرقبونها وکانت فتاة الحی ممن ینیرها

مبرزة لا یجعل الستر دونها اذا خمد النیران لاح بشیرها

حقیقت یہ ہے کہ اہل عرب نے زمانہ جاہلیت میں لباس کے متعلق بہت ترقی کر لی تھی۔ اگرچہ یہ ترقیاں صرف امراء اور سرداران قبائل تک محدود تھیں۔ لیکن جن لوگوں میں تھیں، پوری تہذیب و شائستگی کے ساتھ تھیں۔ عورتوں کے لئے لباس کے جو اقسام اس وقت تک ایجاد ہو چکے تھے وہ جسم کے ہر حصے کے لئے بخوبی پردہ پوش تھے لباسوں کا یہ تنوع زیادہ تر فخر و امتیاز کی بناء پر تھا اور یہی وجہ تھی کہ عوام کا طبقہ اس سے محروم تھا۔ جہاں تک ہماری تحقیق ہے، عورتوں کے لباس کے متعلق دولت بنو امیہ اور عباسیہ کے عہد میں کوئی معتدبہ اضافہ نہیں ہوا۔ یعنی زمانہ جاہلیت میں جس قدر لباس ایجاد ہو چکے تھے، اس سے زیادہ اقسام پیدا نہیں ہو سکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پردہ اور ستر بدن کا خیال جاہلیت ہی میں خوب زور پکڑ چکا تھا۔ عورتیں مختلف وضع کے کرتے استعمال کرتی تھیں جن کی قسمیں سات آٹھ سے کم نہ تھیں اور اسی اعتبار سے ان کے مختلف نام تھے۔ مثلاً درع، اتب، قرقل، صدار، مجول، شوذر، خمیعل۔ ان

میں باہم بہت خفیف فرق ہوتا تھا۔ ان کی وضع محرم، کمری، فتوحی اور قمیص سے ملتی جلتی تھی۔ اشعار جاہلیت میں تقریباً یہ سب نام ملتے ہیں۔ لیکن بلحاظ تطویل ہم ان اشعار کو قلم انداز کرتے ہیں۔ قصابہ، مقنع وغیرہ بھی استعمال کئے جاتے تھے۔

ان کپڑوں کی ترتیب یہ تھی کہ سب سے پہلے ایک رومال سر پر باندھا جاتا تھا جس سے سر کے دونوں اگلے اور پچھلے حصے چھپ جاتے تھے لیکن بیچ کا حصہ کھلا رہتا تھا اس کو بخنق کہتے تھے۔ اس کے بعد ایک اور رومال باندھتے جس سے یہ مقصود ہوتا تھا کہ بالوں میں تیل لگا ہو تو اس میں جذب ہو کر رہ جائے اور دوپٹہ میں نہ لگنے پائے۔ اس کا نام غفارہ تھا۔ غفارہ کے اوپر مختلف طول وعرض کے دوپٹے استعمال کئے جاتے تھے جن کے نام یہ ہیں، صدار، خمار، نصیف، مقنعہ، مفجر، رداء۔ خمار نہایت چھوٹا ہوتا تھا۔ اس سے بڑا نصیف اور نصیف سے بڑا مقنعہ وہکذا۔ خمار وغیرہ کو اکثر اس انداز سے اوڑھتی تھیں کہ چہرہ کا اکثر حصہ چھپ جاتا تھا۔ اسی بناء پر شاعر کا قول ہے:۔

سقط النصیف ولم ترد اسقاطه　　فتنا دلته واتقتنا بالید!

فخرعلی الولاءة لم یوسد!　　وقد کان الرداء لها خمار

لیکن خاص چہرہ کی حفاظت کے لئے برقع ہوتا تھا جس کی مختلف قسمیں تھیں۔ جو صرف آنکھ تک کا ہوتا تھا اس کو "وصواص" کہتے تھے۔ اس سے نیچا نقاب کہلاتا تھا۔ نقاب سے نیچا لفام اور اس سے نیچا لثام کے نام سے موسوم تھا۔ لفام کی حد ہونٹوں سے متجاوز نہ تھی۔ سب سے بڑا نقاب جو چہرہ بلکہ سینہ کو بھی چھپاتا تھا، اس کو جشہ کہتے تھے۔ نقاب کے یہ تمام اقسام زمانۂ جاہلیت میں پیدا ہو چکے تھے اور استعمال کئے جاتے تھے۔ اشعار ذیل سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

ارین محاسنا وکنن اخری　　وثقبن الوصاوص للعیون!

یضیئ لنا کالبدر تحت غمامة　　وقد زل عن غرالثنایا لفامها

غرض لباس کا پردہ تمام عرب میں جاری تھا اور بجز عوام اور کنیزوں کے تمام عورتیں اس کی پابند تھیں۔

بعض مثالیں اس رسم کے خلاف ملتی ہیں۔ مگر وہ نہایت شاذ ہیں لیکن دوسری قسم کا پردہ یعنی عورتوں کا مردوں کی سوسائٹیوں میں شریک نہ ہو سکنا زمانۂ جاہلیت

میں بالکل نہ تھا۔ عورتیں عموماً مجلسوں، بازاروں، لڑائیوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ بازار عکاظ میں جہاں شعراء طبع آزمائیاں کرتے تھے، شاعرہ عورتیں جاتی تھیں اور ان کے مستقل دربار قائم ہوتے تھے۔ وہ عام مجمع میں قصیدے پڑھتی تھیں اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کرتی تھیں۔

ایک بار خنساء جو مرثیہ کہنے میں تمام عرب میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی، عکاظ میں گئی۔ اور نابغہ ذبیانی کے سامنے، جو اس وقت استاذ الشعراء تھا، اپنا قصیدہ پڑھا۔ نابغہ نے کہا افسوس، ابھی ایک شخص کو میں اشعر العرب کا خطاب دے چکا ہوں، ورنہ تجھ کو یہ خطاب دیتا۔ تاہم کہتا ہوں کہ تو عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ خنساء نے کہا نہیں بلکہ میں اشعر الرجال والنساء ہوں۔

عام قاعدہ تھا کہ کسی گاؤں میں کسی شاعر کا گذر ہوتا تو وہاں کی تمام عورتیں اس کے پاس آتی تھیں اور شعر پڑھنے کی فہمائش کرتی تھیں اور چونکہ وہ عموماً سخن فہم ہوتی تھیں۔ شعراء بھی بڑے ذوق سے ان کو اپنے اشعار سناتے تھے۔ غرض مشاعرہ، منافرہ، میلے، بازار، دنگل، میدان جنگ، کوئی ایسا مجمع، مجلس نہ تھی جس میں عورتیں بلا تکلف شریک نہ ہوتی ہوں۔

یہ زمانۂ جاہلیت کا حال تھا۔ اسلام کے زمانے سے نیا دور شروع ہوا۔ اس عہد میں جو تغیرات اور اصلاحات ہوئیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اسلام نے سب سے پہلے اصلاح یہ کی کہ جاہلیت کے کرتوں کے گریبان بہت چوڑے ہوتے تھے جس سے سینے نظر آتے تھے۔ اس پر ذوقعدہ ۵ھ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ	"اور چاہیئے کہ وہ اپنے دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈال لیا کریں"

عینی نے بخاری کی شرح میں اس موقع پر لکھا ہے۔

وذالك لان جيوبهن كانت واسعة تبدوا منها نحورهن و صدورهن وما حواليها وكن يدلين الخمر من وراءهن فتبقى مكشوفة فامرن بان يدلينها من قدامهن حتى يغطينها:

(ترجمہ) "یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کہ ان کے گریبان چوڑے ہوتے تھے جن سے ان کے سینے اور اس کے اطراف نظر آتے تھے اور وہ دوپٹوں کو پشت کی طرف ڈالتی تھیں اس لئے سینے کھلے رہ جاتے تھے اس لئے ان کو حکم ہوا کہ سامنے ڈالیں تاکہ سینہ چھپ جائے۔"

نقاب اور برقع کا طریقہ اگرچہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ پہلے سے جاری تھا لیکن مدینہ منورہ میں یہود کے اختلاط کی وجہ سے اس کا رواج کم ہو چلا تھا۔ اکثر عورتیں کھلے منہ نکلتی تھیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ۔	"اے پیغمبرؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی بیویوں سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادر ڈال لیا کریں (یعنی چادروں سے منہ چھپا لیا کریں)۔"

اس آیت سے متعلق تین حیثیت سے بحث ہو سکتی ہے۔

آیت کا شان نزول کیا ہے؟

آیت کے معنی کیا ہیں؟

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہؓ کا طریقہ عمل کیا رہا۔

شان نزول کے متعلق تفسیر ابن کثیر میں جو محدثانہ تفسیر ہے، یہ تصریح ہے

كان ناس من فساق اهل المدينة يخرجون بالليل حين يختلط الظلام الى طريق المدينة فيعرضون للنساء وكانت مساكن اهل المدينة ضيقة، فان كان الليل خرج النساء الى الطرق، يقضين حاجتهن	"مدینہ میں بدمعاشوں کا ایک گروہ تھا جو رات کی تاریکی میں نکلتا تھا اور عورتوں کو چھیڑتا تھا۔ مدینہ کے مکانات چھوٹے اور تنگ تھے۔ رات کو جب عورتیں قضائے حاجت کے لئے گھروں سے نکلتی تھیں تو یہ بدمعاش ان سے برا ارادہ کرتے تھے جس عورت کو دیکھتے تھے کہ

تکان اولئك الفساق یبتغون	چادر میں چھپی ہوئی ہے اس کو
ذالك منھن فاذ رأو االمرأة علیھا	شریف زادی سمجھ کر چھوڑ دیتے
جلباب قالوا ھذہ حرۃ فکفوا	تھے۔ ورنہ کہتے تھے یہ لونڈی
عنھا واذا رأو االمرأۃ لیس	ہے اور اس پہ حملہ کرتے
علیھا جلباب قالوا ھذہ امۃ	تھے۔"
فوثبوا علیھا	

طبقات ابن سعد جو نہایت قدیم یعنی تیسری صدی کی تصنیف ہے اس میں بھی یہی شان نزول لکھا ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں:

کان رجل من المنافقین	(ترجمہ) "ایک منافق تھا جو مسلمان
یتعرض لنساء المؤمنین	عورتوں کو چھیڑا کرتا تھا تو جب اس
یوذیھن فاذا قیل لہ قال	سے کہا جاتا تھا تو کہتا تھا میں نے
کنت احسبھا امۃ فامرھن	اس کو لونڈی سمجھا تھا۔ اس بنا پر خدا
اللہ ان یخالفن زی الاماء	نے حکم دیا کہ لونڈیوں کی وضع نہ بنائیں
ویدنین علیھن من	اور اپنے اوپر چادریں ڈال لیں۔ اس
جلابیبھن تخمر وجھھا	طرح کہ بجز ایک آنکھ کے باقی سب
الا احدی عینیھا	چہرہ چھپ جائے۔"

تفسیر کشاف میں ہے:

فامرن ان یخالفن بزیھن	"اس لئے ان کو حکم ہوا کہ
عن زی الاماء بلبس الاردیۃ	لونڈیوں کی وضع سے الگ وضع اختیار
والملاحف وستر الرؤس	کریں۔ یعنی چادریں اور برقع استعمال
والوجوہ	کریں اور سر اور چہرہ چھپائیں۔

ان تصریحات میں ایک خاص امر یاد رکھنا چاہیئے وہ یہ کہ ابن کثیر کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ بیبیوں اور لونڈیوں کے لباس اور وضع میں فرق تھا اور وہ یہ تھا کہ بیبیاں چادروں سے چہرہ چھپاتی تھیں اور لونڈیاں کھلے منہ نکلتی تھیں۔ اشعار جاہلیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

"تمہاری عورتوں کے چہرے لڑائی میں کھل گئے تھے اس لئے لونڈیاں معلوم ہوتی تھیں حالانکہ وہ لونڈیاں نہ تھیں۔

ابن کثیر کی عبارت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانے میں یہ فرق قائم تھا اور اسی وجہ سے جب کوئی بی بی کھلے منہ نکلتی تھی تو بدمعاشوں کو ان کے چھیڑنے کے لئے یہ عذر ہاتھ آتا تھا کہ ہم نے ان کو لونڈی سمجھا تھا۔

آیت کے معنی کے متعلق دو لفظ بحث طلب ہیں، جلباب اور ادناء۔ جلباب کے معنی میں اگرچہ متاخرین نے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں لیکن محقق یہ ہے کہ جلباب ایک قسم کا برقع اور چادر تھی جو تمام کپڑوں سے زیادہ وسیع ہوتی تھی اور اس لئے سب کے اوپر استعمال کی جاتی تھی جس طرح آج کل ترکی خواتین فراجہ استعمال کرتی ہیں۔ تفسیر عماد ابن کثیر میں ہے :-

والجلباب هو الرداء فوق الخمار	"جلباب چادر کو کہتے ہیں جو خمار کے
قاله ابن مسعود وعبيدة	اوپر استعمال کی جاتی ہے۔ عبداللہ
والحسن البصري وسعيد بن	ابن مسعود، عبیدہ، حسن بصری،
جبير وابراهيم النخعي و	سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، عطاء
عطاء الخراساني وغير واحد،	خراسانی وغیرہ نے جلباب کے یہی
	معنی بیان کئے ہیں"۔

دوسرا لفظ جو بحث طلب ہے وہ ادناء ہے۔ ادناء جلباب کے معنی تمام مستند مفسرین نے جو فن لغت کے بھی امام ہیں، منہ چھپانے کے لکھے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور تمام صحابہ میں فن تفسیر کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ ان کا قول تفسیر ابن کثیر میں علی بن طلحہؓ نے نقل کیا ہے:

امر الله نساء المؤمنين اذا	"خدا نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ
خرجن من بيوتهن في حاجة	جب گھر سے کسی کام کو نکلیں تو سر سے
ان يغطين وجوههن من فوق	چادر اوڑھ کر چہروں کو چھپالیں اور
رؤسهن بالجلباب ويبدين	ایک آنکھ کھلی رکھیں۔
عينا واحدة.	

تفسیر معالم التنزیل میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔

قال ابن عباس وابوعبیدۃ امرنساء المؤمنین ان یغطین رؤسھن ووجوھھن بالجلابیب الاعینا واحدۃ

"ابن عباس اور عبیدہ کا قول ہے کہ خدا نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ چادر سے اپنا سر اور چہرہ چھپائیں بجز ایک آنکھ کے"

طبقات ابن سعد میں ہے[1]

عن محمد بن عمر عن ابی بسرۃ عن ابی صخر عن ابن کعب القرظی قال کان رجل من المنافقین یتعرض لنساء المؤمنین یوذیھن. فاذا قیل لہ قال کنت احسبھا امۃ. فامرھن اللہ ان یخالفن زی الاماء ویدنین علیھن من جلابیبھن تخمر وجھھا الا احدی عینیھا

محمد ابن عمر نے ابوبسرہ سے، انہوں نے ابوصخر سے انہوں نے ابن کعب قرظی سے روایت کی ہے کہ مدینہ میں ایک منافق تھا جو مسلمان خواتین کو چھیڑا کرتا تھا اور جب اس کو ٹوکا جاتا تھا تو کہتا تھا کہ میں نے لونڈی سمجھا تھا تو خدا نے حکم دیا کہ لونڈیوں کی وضع ترک کریں اور اپنے اوپر اس طرح سے چادر ڈال لیں کہ چہرہ چھپ جائے بجز ایک آنکھ کے۔"

تفسیر کشاف میں ادناء جلباب کی یہ تفسیر کی گئی ہے:

یرخینھا علیھن ویغطین بھا وجوھھن

"چادر کو اپنے اوپر ڈال لیں اور چہرہ کو چھپالیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباس، ابوعبیدہ، ابن کعب قرظی، بغوی، ابن کثیر اور زمخشری اس درجہ کے لوگ ہیں کہ ان کے مقابلہ میں اگر کسی مخالف کا قول ہوتا بھی تو اس کی کیا وقعت ہو سکتی تھی۔ لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے، شاذ و نادر کے سوا تمام اہل لغت اور مفسرین نے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

اس صورت میں صرف شاہ ولی اللہ صاحب کے مبہم ترجمہ سے ایسے معرکۃ الآراء مسئلہ میں استدلال کرنا کس قدر تعجب انگیز ہے۔

---

[1] جلد ہشتم صفحہ ۱۲۷، مطبوعہ یورپ

پردہ کے متعلق تمام دنیا میں مسلمانوں کا جو طریق عمل رہا وہ یہ تھا کہ کبھی کسی زمانہ میں عورتیں بغیر برقع اور نقاب کے باہر نہیں نکلتی تھیں اور بجز کسی حالت کے نامحرموں سے ہمیشہ منہ چھپاتی تھیں۔ یہانتک کہ یہ امر معاشرت کا سب سے مقدم مسئلہ بن گیا تھا۔ تصدیق اس کی واقعات ذیل سے ہوگی۔

ایک دفعہ مغیرہ بن شعبہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں فلاں عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پہلے جاکر اسے دیکھ آؤ۔ انہوں نے جاکر اس عورت کے والدین سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔ صحابہ جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت کرتے تھے، محتاج بیان نہیں، تاہم والدین کو ناگوار ہوا کہ ان کی لڑکی ان کے سامنے آئے اور یہ اس پہ نظر ڈال سکیں۔ لڑکی پردہ میں سے یہ باتیں سن رہی تھی۔ بولی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے تو تم مجھ کو آکر دیکھ لو۔ ورنہ میں تم کو خدا کی قسم دلاتی ہوں کہ ایسا نہ کرنا۔ یہ واقعہ سنن ابن ماجہ باب النکاح میں مذکور ہے۔

محمد بن سلمہ ایک صحابی تھے۔ انہوں نے ایک عورت سے شادی کرنی چاہی اور اس لئے چاہا کہ چوری چھپے کسی طرح عورت کو دیکھ لیں۔ لیکن موقع نہیں ملتا تھا یہاں تک کہ ایک دن وہ عورت اپنے باغ میں گئی۔ انہوں نے موقع پاکر اسے دیکھ لیا۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو نہایت تعجب سے انہوں نے ان سے کہا آپ صحابی ہوکر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب کسی عورت سے شادی کا ارادہ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ پہلے اس کو دیکھ لیا جائے۔

(سنن ابن ماجہ، باب النکاح)

صاحب اغانی نے اخطل کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ اخطل سعید بن ایاس کا مہمان ہوا۔ سعید نے بڑے تپاک سے مہمانداری کی۔ یہاں تک کہ اس کی دونوں لڑکیاں، جن کا نام زعوم وامامہ تھا، اخطل کی خدمت گزاری میں مصروف رہیں۔ دوسری دفعہ جب اخطل کو یہ موقع پیش آیا تو لڑکیاں جوان ہو چکی تھیں۔ اس لئے اخطل کے سامنے نہ آئیں۔ اغانی کے خاص الفاظ یہ ہیں:۔

ثم نزل علیہ ثانیۃ	"اخطل دوبارہ سعید کا مہمان
وقد کبرتا فحجبتا	ہوا تو لڑکیاں بڑی ہو چکی تھیں

فقال عنهما وقال ابن ابنتای فاخبر بکبهما۔

اس لئے انہوں نے پردہ کیا۔ اخطل نے پوچھا کہ تیری لڑکیاں کہاں ہیں؟ سعید نے کہا اب وہ بالغ ہو گئی ہیں۔

پردہ کا اس قدر رواج ہو گیا تھا کہ جب کبھی کوئی واقعہ اس کے خلاف پیش آیا ہے تو مؤرخین اور واقعہ نگاروں نے ایک مستثنیٰ واقعہ کی طرح اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے سفرنامہ میں جہاں ترکوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک عورت کا ذکر کر کے لکھتا ہے:

وھی بادیۃ الوجہ لان نساء الاتراک لا یحتجبن

"اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ ترکی عورتیں پردہ نہیں کرتیں"۔

صاحب اغانی نے اخطل کے تذکرے میں ایک ضمنی موقع پر لکھا ہے:

وکان اھل البدو اذ ذاک یحدث رجالھم الی النساء لا یرون بذالک بأسا۔

"اس زمانہ میں صحرانشین عربوں میں مرد عورتوں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے اور ان سے بات چیت کرتے تھے اور اس کو معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔

اسی کتاب میں جمیل کے تذکرہ میں "جو ایک بدوی شاعر تھا" لکھا ہے:

ان جمیل بن معمر خرج فی یوم عید والنساء اذ ذاک یتزین ویبدو بعضھن لبعض ویبدون للرجال فی کل عید

"جمیل بن معمر ایک دفعہ عید کے دن نکلا۔ اس زمانہ میں عید کے دن عورتیں آراستہ ہو کر ایک دوسرے سے ملتی تھیں اور مردوں کے سامنے آتی تھیں"۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کا پردہ کرنا اور منہ چھپانا مسلمانوں کی عام معاشرت تھی۔ اس کے خلاف کوئی واقعہ ہے تو وہ کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کتابوں میں بطور ایک مستثنیٰ واقعہ کے ذکر کیا جاتا ہے

اس موقعہ پر ہم دوبارہ اپنے قومی نامور مصنف (مولوی امیر علی) کے ان الفاظ کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ

"خلفاء کے زمانہ تک اعلیٰ طبقہ کی عورتیں بلا برقع کے مردوں کے سامنے آتی تھیں

توضیح وتنقیح

مکتوب گرامی حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی اور وضاحت از امیر تنظیم اسلامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی جناب' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

وَفَّقَکُمُ اللّٰہُ تَعالٰی وَاِیَّانَا لِمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی وَیَجْعَلُ اٰخِرَتَنَا خَیْرًا مِنَ الاُولٰی

سلام مسنون! احقر اپنی طویل علالت کے باوجود جن چند ماہوار رسائل کا مطالعہ کرتا ہے ان میں سے میثاق بھی ہے۔ اور یہ شوق مطالعہ ۱۹۷۴ء سے اس وقت شروع ہوا جبکہ جناب پہلی قرآن عزیز کانفرنس منعقد کرنے کے لئے اس گناہ گار کو بھی شرکت بلکہ صدارت کی عزت بخشنے کے لئے یہاں تشریف لائے تھے۔ چونکہ وہی تاریخیں احقر کے سفرِ حج کے لئے مقرر ہو چکی تھیں اس لئے اس سعادت سے محروم رہا۔ مگر میثاق کا مطالعہ باقاعدہ جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔

میثاق بابت فروری ۱۹۸۸ء میں آپ کی وہ نصیحت بڑی پسند آئی جو آپ نے ناروے کے اقبال ڈے کی تقریب میں شریک جناب سردار عبدالقیوم خان اور جسٹس جاوید اقبال کے اس مناقشہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمائی تھی کہ:

> "پھر ہمیں تو حضور (انور صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلقین و تعلیم یہ ہے کہ اُذکُروا مَوتاکُم بِالخَیرِ- یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ بزرگوں کو معبود بنا لیں اور انہیں تنقید سے بالاتر سمجھیں۔ ان پر تنقید کرنا کوئی حرام نہیں لیکن اُذکُروا مَوتَاکُم بِالخَیرِ کا اصول بالعموم یہ ہو گا کہ عام طور پر ان کا ذکرِ خیر اور بھلائی سے ہونا چاہئے بلکہ اس حدیث کے اگلے ٹکڑے میں تو اس نوعیت کے الفاظ آتے ہیں فَاِنَّہم قَد بَلَغوا اِلٰی مَاعَمِلُوا (او کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی انہوں نے جو عمل کیا تھا اس حد تک وہ پہنچ چکے ہیں۔ اب تم خواہ مخواہ ان کے بارے میں زبان طعن دراز کرو تو اس کا کیا حاصل؟ تِلکَ اُمَّۃٌ قَد خَلَت لَہا مَا کَسَبَت وَلَکُم

مَا كَسَبْتُمْ ج وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (البقرہ: ۱۴۱) (ترجمہ) وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، سو ان کو ان کے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال کا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہوگی۔" (ص ۴۸)

اس کے بعد آپ نے اسی صفحہ پر ایک عنوان "اسلاف سے اختلاف میں احتیاط ملحوظ رہے" کا اضافہ فرما کر بحث کا خاتمہ فرمایا ہے۔

مگر میثاق دسمبر ۱۹۹۲ء میں آپ ہی کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

"رہا فارسی قطعہ تو اس کے ضمن میں اگرچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کا یہ اعتراض تو بالکل بجا تھا کہ "میں نے ملت نہیں قوم کا لفظ استعمال کیا تھا" اور اس پر حضرت علامہ نے بھی نہایت وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت کر لی تھی، لیکن مولانا مدنیؒ کے اس قول کے بارے میں کہ "میرا یہ کہنا کہ آج کل قومیں وطن سے بنتی ہیں محض خبریہ تھا انشائیہ نہ تھا" ان کی تمام تر جلالت قدر اور ان کے تقویٰ و تدین اور مجاہدانہ سیرت و کردار کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک بالکل مہمل بات تھی، اس لئے کہ مولانا ایک سیاسی اور مذہبی قائد تھے اور اس اعتبار سے ان کی ہر بات میں "انشاء" اور مشورہ کا رنگ ہونا بالکل فطری امر تھا۔ اور علامہ اقبال کی تنقید بھی اصلاً مغرب کے اس نظریئے ہی پر تھی کہ قوم وطن سے بنتی ہے! (ملت کا لفظ تو غالباً صرف ضرورتِ شعری کے تحت استعمال ہوگیا تھا۔) اور کفر اور شرک ایسے امراض ہر دور میں جو نئے لباس پہن کر اور نت نئے بھیس بدل کر اولادِ آدم کی گمراہی کے درپے ہوتے ہیں ان کی

"بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم!"

کے انداز میں صحیح پہچان کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہوتا ہے جو اس دور میں مبدءِ فیض سے علامہ اقبال کو عطا ہوا تھا۔۔۔ بقول خود ان کے کہ

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ" (ص ۲۸)

آپ نے اپنے اس مضمون میں: ایک تو اپنے اس عندیہ کی عملی مخالفت کی ہے جس کا اظہار

آپ نے ۱۹۸۸ء میں کیا تھا۔ اس طرح آپ "وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ" کا مصداق ہوئے۔ دوسرا آپ نے اس مضمون کو جو نصف صدی سے زیادہ پہلے طے ہو چکا تھا از سرِ نو باعث تشتتِ افکار اور اختلافِ آراء بنا کر ایک تو علامہ اقبال کی روح کو صدمہ پہنچایا کہ ان کی نصیحت اور دعا تو یہ تھی:

سید کی لوحِ تربت پر

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے
محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

اور تیسرا آپ نے علمِ عروض و قافیہ سے ناواقفیت کے لئے یہ مفروضہ گھڑ لیا کہ "ملت کا لفظ تو غالباً ضرورت شعری کے تحت استعمال ہو گیا تھا"۔

اس کا اظہار نہ تو علامہ نے کیا اور نہ ان کے شارحین نے کیا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ علامہ کو اسی کلمہ سے مغالطہ دیا گیا۔ ورنہ جس ہندی قومیت کی تبلیغ اور پرچار وہ ہمیشہ کرتے رہے تھے ۱۹۳۸ء میں جبکہ ابھی تک "پاکستان" کا کلمہ بھی عمومی شہرت سے عاری تھا اس پر اس قدر تنقید وہ ہرگز نہ کرتے۔ دراصل ان کو مغالطہ دیا گیا اور بہتان تراش وہ مولوی مظہرالدین شیر کوٹی تھا جو پہلے حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی انقلابی جماعت کا سرگرم رکن تھا' لیکن مسلم لیگ میں آ جانے کے بعد "خرج کلہ" کا مصداق بن گیا۔ اس کا روزنامہ "الامان" اور ہفتہ وار "وحدت" الزام تراشی اور علماءِ کرام پر سب و شتم کے لئے وقف تھا۔ اگرچہ اس وقت کا لیگی پریس عموماً یہ خدمت ادا کر رہا تھا مگر شیر کوٹی بہت آگے تھا۔ حریت دہلی نے ایک خاص نمبر شائع کیا تھا جس کا نام "گالی نمبر" تھا۔ مظہرالدین اسی ناک میں رہتا تھا کہ استراقِ سمع کر کے کچھ اپنی طرف سے ملا کر شر و فساد پھیلائے ورنہ ہندی قومیت کا ذکر حضرت مدنی اپنی ہر سیاسی تقریر میں فرماتے تھے' اس پر نہ کبھی کسی نے اس لہجے میں اعتراض کیا نہ طوفان بے تمیزی کھڑا کیا۔ حضرت مدنی کے اس جملہ کے سیاق و سباق کا لحاظ کئے بغیر الامان میں شائع کر دیا جسے پھر احسان لاہور نے شائع کیا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت اقبال اس رات دلی میں تھے اور مظہرالدین نے خود جا کر ان کو یہ افتراء سنایا۔ ان اشعار کے شائع ہونے پر جب حقیقتِ حال

سامنے آئی اور حضرت مدنی کے خدام نے نظماً اور نثراً دفاع کیا تو علامہ اقبال نے رجوع کر لیا۔ یہ ان کی عالی ظرفی اور وسعت قلبی تھی یا حقیقت پسندی تھی۔ آپ نے اپنا بیان ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو روزنامہ احسان لاہور میں شائع فرمایا جبکہ ان کی وفات صرف ۲۳ دن بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہو گئی۔ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" نامی کتاب میں یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال نے ان اشعار کو شائع کرنے کی ممانعت فرما دی تھی۔ مگر ان کی وفات کے بعد چودھری محمد حسین (جن کے بارہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ لاہوری مرزائی تھا (واللہ اعلم) کی زیرِ نگرانی "ارمغانِ حجاز" طبع ہوئی تو اس میں یہ اشعار بھی طبع کر دیئے گئے۔ پھر جوابات اور ازالۂ شبہات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ احقر نے بھی ایک رسالہ بہ نام "اذانِ حجاز در جواب ارمغانِ حجاز" لکھا جو شائع بھی ہوا اور ساتھ ہی "اذانِ حجاز کامل" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جس میں علامہ سید سلیمان ندوی اور دوسرے اکابر علماءِ ملت کے وہ سب مضمون جمع کر دیئے تھے جو حضرت مدنی پر اس الزام تراشی کے جواب میں لکھے گئے تھے۔ جب حضرت مدنی سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے سختی سے منع فرمایا کہ اس کو شائع نہ کیا جائے۔ یہ حضرت کی وسعت قلبی تھی۔

علامہ اقبال کو لفظ "ملت" ہی سے دھوکہ دیا گیا تھا۔ یہ ضرورت شعری نہ تھی' علامہ جیسا قادرِ کلام اس قدر عاجز نہ تھا کہ وہ قوم کی جگہ ملت کو وزنِ شعری کے لئے استعمال کرتا۔

تیسرا آپ نے حضرت مدنی کی اس وضاحت کو مہمل قرار دیا کہ وہ جملہ خبریہ تھا۔ یعنی آپ (مولانا مدنیؒ) یہ بتا رہے تھے آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں۔ ان کا اپنا عندیہ یہ نہ تھا کہ مذہب کو چھوڑ کر ایک متحدہ قومیت اختیار کی جائے۔ آپ کا یہ جملہ انشائیہ نہ تھا یعنی آپ نے یہ حکم نہیں دیا کہ برِصغیر کے مسلمان آج کل کی لادینی قومیت کو اختیار کریں۔ آپ کا یہ کلام مہمل کیسے ہوا؟ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے معلوم کرتے ہوئے اپنے کلام سے رجوع فرما لیا مگر آپ نے حضرت مدنی کی اس وضاحت کو اس طرح بیان کیا کہ آپ نے یہ بہانہ بنایا اور مغالطہ دیا ورنہ آپ کی تبلیغ اسی لادین نظریۂ قومیت کی تھی۔ یہاں بھی آپ نے حضرت اقبال کی مدح کے پردے میں ان کی قدح کی ہے۔ اور حضرت مدنی کے متعلق آپ کا تجزیہ حدودِ ادب و اخلاق سے متجاوز ہے وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔

اب اس اجمال کی تفصیل پیش کرتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علامہ اقبال عظیم مفکر و فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے اور شاعر کے لئے جذباتی ہونا ضروری ہے' کلام کی آورد کے لئے جذبات ہی محرک ہوتے ہیں۔ اور جو کلام جذبات کی وجہ سے کہی جائے وہ حقیقی کم' مصنوعی زیادہ ہوتی ہے۔ یہی حکمت ہے کہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ارشاد فرمایا: وَمَا عَلَّمْنَاہُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ (ترجمہ) نہ تو ہم نے آپ کو شعر کی تعلیم دی اور نہ

آپ کے مناسب ہے۔ (یٰسٓ: ۶۹)

انبیاء علیہم السلام کو جو ارشاد من جانب باری تعالیٰ ہوتا ہے اس کو بیان فرما دیتے ہیں' خود کلام نہیں بناتے بلکہ کلام پہنچاتے ہیں اور یہی رسولؐ کا مفہوم ہے۔ اس لئے اگر محرک اچھا ہوا تو کلام اچھا ہو گا ورنہ غیر مناسب ہو گا۔ علامہ اقبال بھی جذباتی تھے' اگرچہ ان کے مداح پروفیسر محمد عثمان نے اپنی مرتبہ کتاب "اقبال ایک جذباتی دور میں" علامہ کے ایک دور کو جذباتی قرار دیا مگر وہ آخر تک جذباتی تھے۔ انہوں نے صرف حضرت مدنی کے خلاف ہی یہ اشعار نہیں کہے بلکہ اس سے پہلے کئی اشعار کئی مقتدر اشخاص کے بارہ میں کہہ کر رجوع کر چکے تھے۔ لسان الغیب حافظ شیرازی (جن کو تصوف اور احسان میں ایک عظیم مقام حاصل ہے) پر علامہ نے ۳۵ اشعار میں سخت تنقید کی تھی جو ان کی پہلی تصنیف "مثنوی اسرارِ خودی" مطبوعہ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی مگر انہوں نے علماءِ کرام اور مشائخِ عظام کے دباؤ سے مرعوب ہو کر اسے ہمیشہ کے لئے اس کتاب سے خارج کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جذباتی ہونے کے باوجود ضدی نہ تھے۔ جوں ہی انہوں نے کسی کلام کو بھی کسی لحاظ سے غیر موزوں اور نامناسب سمجھا اس سے رجوع کرنے یا اپنے کلام سے خارج کرنے کو عار نہیں سمجھا اور یہ بہت بڑا اخلاقی پہلو ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر آپ کے وہ اشعار ہیں جو آپ نے محمد علی جناح کے بارہ میں کہے جب کہ آپ قائداعظم کے مقام پر فائز نہ تھے جس کا مختصر سا حال یہ ہے کہ جب محمد علی جناح ۱۹۳۱ء میں لندن سے مسلم لیگ کے اتحاد اور تنظیمِ نو کے لئے آئے تو علامہ اقبال نے ان کا استقبال مندرجہ ذیل پانچ اشعار سے کیا جو اس وقت کے تمام اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ خصوصاً مولانا ظفر علی خان کے اخبار زمیندار نے اخبار کے صفحۂ اول پر نمایاں طور پر مندرجہ ذیل اشعار کو شائع کیا تھا:

لندن کے چرخ نادرۂ فن سے پہاڑ پر — اترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی بتا ہمیں — اے جان برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیالِ دشت و بیاباں نکال دے — مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب — اس دین میں ہے ترکِ سوادِ حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظرِ ما رسیدہ است — یعنی حجابِ غیبتِ کبریٰ دریدہ است

یہ اشعار علامہ اقبال کے مروج و مدون مجموعہ کلام میں تو شائع نہ ہوئے مگر محمد انور حارث بی۔ اے کی مرتبہ کتاب بہ نام رختِ سفر (شاعرِ مشرق کا غیر مدون کلام) شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی بندر روڈ مطبع ۱۹۵۲ء کے ص ۱۴۲ پر موجود ہیں۔

ایک علمی اور تاریخی لطیفہ :- جنرل ضیاء الحق شہید نے ۲۵ دسمبر ۱۹۶۹ء میں اپنی ایک نشری تقریر میں "اترے مسیح بن کے محمد علی جناح" بطورِ مدح اور تعریف بول دیا تھا جس پر راولپنڈی کے سجاد حیدر صاحب نے یہ استفسار کیا تھا کہ کیا یہ واقعی علامہ اقبال کا مصرع ہے تو کرنل سالک شہید نے مندرجہ ذیل جواب فرمایا تھا:-

"میری معلومات کے مطابق یہ مصرع واقعی علامہ اقبال کا ہے۔ یہ اس نظم سے لیا گیا ہے جو علامہ مرحوم نے لکھی اور روزنامہ زمیندار لاہور کی اشاعت ۹ نومبر ۱۹۲۱ء کے صفحۂ اول پر چھپی تھی۔ یہی نظم رختِ سفر مرتبہ انور حارث کے ص ۱۵۲ پر بھی درج ہے۔" (روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۱۰ جنوری ۱۹۷۰ء)

جناب ڈاکٹر صاحب! اب تو آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ علامہ اقبال کس قدر جذباتی تھے۔ انہوں نے اگر حضرت مدنی کے بارہ میں "بو لہبی" کہہ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا تو حضرت قائداعظم کے بارہ میں ان پانچ اشعار میں کس قدر زیادتی کی ہے۔ ہو سکتا ہے اس وقت ان کے ساتھ نظریاتی اختلاف ہو مگر ان اشعار میں تو ان کے مذہب' اخلاق اور کردار پر ایسا حملہ کیا ہے جو ان کا شدید مخالف بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس کی تشریح اور تفسیر آپ جیسا عالم اور تاریخ داں اور بہ اصطلاحِ جدید دانش ور بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مگر آج تک اقبالیات کے مبلغ اور ان کے کلام کے ناشر اسے شائع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اگر ارمغانِ حجاز میں ان اشعار کا درج کرنا اور شائع کرنا ضروری تھا جن سے علامہ نے آپ کے الفاظ میں وسعت قلبی اور عالی ظرفی کے ساتھ رجوع کر لیا تھا تو پھر ان اشعار کو کیوں شائع نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی ناشر اسے مناسب نہیں سمجھتا تو آپ جیسا حق گو اسے کیوں بیان نہیں کرتا' کیا یہ "مہمل کلام" ہے؟ جب یہ اشعار شائع ہوئے تو کسی بھی لیگی یا دوسرے لیڈر نے علامہ اقبال کو ان اشعار سے رجوع کا مشورہ نہیں دیا' صرف آپ کے دوست مولانا حکیم فضل الرحمٰن مرحوم سواتی مقیم آمبور جنوبی ہند نے آپ کو توجہ دلائی۔ چونکہ آپ کا یہ رجوع اس قابل ہے کہ اس کو محفوظ کیا جائے اس لئے احقر اس رجوع کی ساری سرگزشت جناب حکیم صاحب مرحوم کے کلمات میں درج کرتا ہے۔ جناب حکیم صاحب نے فرمایا:-

"دسمبر ۱۹۲۰ء کے اخیر ہفتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں زیرِ صدارت وجے رگھو اچاریہ منعقد ہوا تھا جس میں مہاتما گاندھی کا نان کوآپریشن والا ریزولیوشن پاس ہو گیا تھا جس کی مخالفت قائداعظم محمد علی جناح نے کی۔ لوگوں نے ان پر شیم شیم کی آوازیں کسی تھیں۔ میں نے بھی زور زور سے شرم شرم کی آواز بلند کی تھی۔ جناح صاحب اس وقت کانگریس سے نکل

گئے۔ ہندوستان میں اب کوئی ادارہ ان کے لئے نہیں رہا۔ مسلم لیگ تو مر چکی تھی' اس جگہ خلافت کانفرنس کام کر رہی تھی' مجبور ہو کر آپ لندن تشریف لے گئے۔ سات آٹھ مہینے کے بعد لندن سے واپس آکر اکتوبر ۱۹۲۱ء میں بمبئی میں اعلان کر دیا کہ لیگ کو پھر زندہ کر دینا چاہئے۔ اس اعلان سے ڈاکٹر اقبال بہت برہم ہوئے اور فوراً تنقیدی قطعہ ارشاد فرمایا جو "صدائے لیگ" کے عنوان سے روزنامہ "زمیندار" مورخہ ۹ نومبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ اس وقت کے تمام اردو اخبارات نے بھی نہایت شاندار طریقے سے شائع کیا اور بہت سے لوگوں کا وردِ زبان رہا: لندن کے چرخ نادرۂ فن سے پہاڑ پر الخ'---- میں نے علامہ اقبال کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ قطعہ تو بہت اچھا ہے لیکن جناح صاحب پر اس قدر سخت تنقید غیر مناسب ہے۔ تمام لوگ قطعہ کو بہت پسند کرتے ہیں مگر میں اس بارے میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی آپ کی طرح جناح صاحب کا مخالف ہوں۔ ناگ پور میں کانگریس کے اجلاس میں جب ان پر شیم شیم کی آوازیں کسی گئیں تو میں نے بھی زور زور سے شرم شرم کی صدا بلند کی۔ میں پکا خلافتی اور کانگریسی ہوں اور وہ ان دونوں کے سخت خلاف ہیں لیکن انہوں نے ۱۹۱۸ء میں جو بہت اہم کام انجام دیا ہے اس کا اثر میرے دل و دماغ پر بہت زیادہ ہے۔ ۱۹۱۸ء میں وزیرِ ہند لارڈ مانٹیگو جب ہندوستان آئے تھے اور پورے ملک کا انہوں نے دورہ کیا تو ایک رپورٹ لارڈ چیمسفورڈ اور مانٹیگو کے نام سے مرتب کی گئی جس میں سفارش تھی کہ ہندوستان میں کافی صلاحیت ہے اس لئے اسے اصلاحات ملنے چاہئیں۔ اس رپورٹ کی تائید تمام صوبہ جات کے گورنروں اور لفٹیننٹ گورنروں نے کی تھی لیکن بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگٹن نے مخالفت کی کہ ہندوستان میں اصلاحات کی قابلیت نہیں ہے۔ ولنگٹن کے اس رویہ کی کسی نے مخالفت نہیں کی' صرف محمد علی جناح ہی تھے جنہوں نے مشرح اور غیر مبہم الفاظ میں مخالفت کی اور لارڈ ولنگٹن کو دشمنِ ہند کہا کہ ایسے دشمنِ ہند گورنری کے لائق نہیں' حکومت برطانیہ کو چاہئے کہ وہ انہیں واپس بلائے۔ جب لارڈ ولنگٹن کی میعاد گورنری ختم ہوئی اور وہ لندن جانے لگے تو بمبئی کے کارپوریشن کی جانب سے لارڈ موصوف کے اعزاز میں جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر مسٹر محمد علی جناح اور ان کی بیوی نے کالی جھنڈیوں سے لارڈ ولنگٹن کا استقبال کیا۔ غیر قوم میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی۔ لہٰذا میں آپ کی خدمت میں باادب التماس کرتا

ہوں کہ از راہِ کرم اس قطعہ کو اپنے مجموعۂ اشعار سے خارج کر دیجئے گا۔ خط لکھ کر دو ہفتے بعد جناب ڈاکٹر اقبال کا نوازش نامہ موصول ہوا جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ واقعی جوش میں آکر میں نے چند تنقیدی اشعار لکھ دئے ہیں لیکن آپ کے خط نے میرے جوش کو فرو کر دیا' میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے بروقت مجھے متنبہ کر دیا۔ آپ کے سوا اور کسی نے مجھے نہ لکھا ہے اور نہ کسی نے زبانی ہی کچھ کہا ہے۔ اس بارے میں لکھنے والے آپ فرد واحد ہیں۔ اطمینان رکھئے کہ میں نے ان اشعار کو آپ ہی کے کہنے سے اپنے مجموعۂ اشعار سے خارج کر دیا ہے۔"

یہ خط و کتابت ماہنامہ "برہان" دہلی کی اشاعت اگست ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ ماہنامہ کے سرپرست علامہ شبیر احمد عثمانی کے حقیقی برادر زادہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن تھے جبکہ اس کے مرتب علامہ سعید احمد اکبر آبادی مرحومین تھے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جن اشعار کا سہارا لے کر آپ نے ۵۴ سال بعد حضرت مدنی کے بارہ میں اپنے بغض کا اظہار کیا ہے ان سے علامہ اقبال نے اسی طرح رجوع کر لیا تھا جس طرح حافظ شیرازی اور قائداعظم کے متعلق کہے گئے اشعار سے رجوع فرما لیا تھا۔ آپ تو اس امر سے بھی باخبر ہوں گے کہ علامہ مرحوم کے کئی اشعار ایسے ہیں جو صرف ان کی زندگی ہی میں نہ کہے گئے بلکہ اخبارات اور رسائل میں بھی شائع ہوئے مگر وہ اس طرح محو کر دئے گئے کہ آج عام لوگوں کو ان کا علم ہی نہیں جیسا کہ رام چندر کی تعریف میں آپ نے چھ اشعار کی ایک نظم کہی جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

جس پر مسجد وزیر خان کے خطیب مولانا ابو محمد سید دلدار علی شاہ نے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا تھا۔

جناب ڈاکٹر صاحب! آپ نے اپنی اس تحریر میں حضرت مدنی پر جو جامہ بدلنے کا الزام لگایا ہے اس کا جواب بھی عرض کرنا ضروری ہے۔ آپ نے حضرت مدنی کا ارشاد: "موجودہ دور میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں" کو بجائے جملہ خبریہ کے جملہ انشائیہ بتایا ہے' یعنی یہ حضرت مدنی اس دور کی لادینی وطنی قومیت کی خبر نہیں دے رہے تھے بلکہ ان کا مشورہ یہ تھا کہ اسے اختیار کیا جائے' اس لئے علامہ اقبال نے اس نظریہ کو بو لہبی قرار دیا۔ اور حضرت مدنی کی اس تشریح کو مہمل قرار دیا ہے۔ حالانکہ حضرت مدنی کے دونوں اقوال میں تعارض نہیں بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ جس وطنیت کو آپ نے موجودہ دور کے ساتھ بیان کیا وہ

وطنیت پرستی اسلام کے سراسر خلاف ہے اور جس وطنی قومیت کا آپ نے نہ صرف مشورہ دیا بلکہ ضروری قرار دیا کہ عیسائی حکومت سے برصغیر آزاد ہو جائے یہ وطنی قومیت شرعاً درست ہے' اس لئے بطور تمہید کے یہ عرض ہے کہ وطنی قومیت کی تین اقسام ہیں۔ ایک تو یہ ہے، کسی وطن میں رہنے والے مختلف اور متعدد مذاہب کے پیروکار اپنے عقائد' عبادات اور شناختی رسوم و اعمال کو بالکل ختم کر کے ملکی اور وطنی یک جہتی میں اس طرح منسلک ہو جائیں کہ وہ یک جان اور یک قالب نظر آئیں۔ اس وطنی قومیت کی نظیر آج کل کے اکثر کمیونسٹ ملک ہیں جن میں بسنے والے مسلمان اپنے ناموں کے ساتھ "محمد" کا مبارک کلمہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اس سے ان کی ممتاز شناخت ہو سکتی جو وہاں کی حکومت کی نظر میں وحدت ملکی کے لئے نقصان دہ ہے۔ ایسے ممالک سے مسلمانوں کو ہجرت کرنا چاہئے اگر استطاعت ہو اور کوئی اسلامی ملک ان کو قبول کرنے پر تیار ہو۔ ورنہ وہ عنداللہ اسی طرح معذور ہیں جس طرح برصغیر کی تقسیم کے وقت تقریباً ایک لاکھ مسلمان عورتوں کو سکھوں اور ہندوؤں نے اغوا کر لیا تھا۔ ان میں سے کچھ تو چتا پر جل گئیں اور کچھ سکھوں اور ہندوؤں کے مظالم کا شکار ہیں' ان کی عزت کی چادر کو تار تار کر دیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ ان کے پاکیزہ بطن سے کفار کے نطفے جنم لے رہے ہیں اور وہ کسی محمد بن قاسم کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں اور وہ آنسوؤں کے سیلابوں میں غوطہ زن ہو کر یہ دعا مانگ رہی ہیں: اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ چونکہ ان ممالک میں آباد مسلمان مجبور ہیں اس لئے وہ عنداللہ قابل مغفرت ہیں۔ قرآن عزیز کا ارشاد ہے: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (النحل: ١٠٥) اسی طرح وہ مجبور اور مقہور خواتین جو ایسے گناہوں کا ارتکاب مجبوراً کر رہی ہیں ان کی مغفرت بھی ہوگی۔ قرآن عزیز کا ارشاد ہے: وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور: ٣٣)

دوسری قسم یہ ہے کہ کسی ملک کے رہنے والے مسلمان اور دوسرے مذاہب کو ماننے والے اپنے اپنے عقائد عبادات اور رسوم پر قائم رہتے ہوئے وطنی قومیت کو اختیار کریں تاکہ ملکی امور میں وہ برابر کے حصہ دار ہوں' لیکن وہ وطنی قومیت کو اپنی دینی حیثیت پر اولیت دیتے ہوں جیسا کہ وہ یہ کہتے ہوں کہ ہم پہلے ہندی ہیں' پہلے ترک ہیں' پہلے عرب ہیں اور دوسرے نمبر پر مسلمان ہیں۔ یہ دونوں قومیتیں اسلام کے خلاف ہیں اور اسلام ان کے خلاف ہے۔ اسلام کے خلاف اسی دوسری قسم کی قومی وطنیت کا پرچار کر کے اسلام کے دشمنوں نے اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کیا۔ خلافت کا خاتمہ اور موجودہ اسلامی ممالک کا باہمی دست و گریبان ہونا اسی قومی وطنیت کا نتیجہ ہے۔ اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند اور ان کی تحریک جو "ریشمی رومال کی تحریک" کے نام سے متعارف ہوئی اور جس کی پاداش میں شیخ الہند کو اپنے تمام [illegible]

مولانا مدنی، مولانا عزیز گل اور حکیم نصرت حسین رحمتہ اللہ علیہم سمیت اس حرمِ اقدس سے عیسائیوں کے حکم سے گرفتار کیا گیا جسے قرآن عزیز نے "حَرَمًا اٰمِنًا" فرمایا۔ اور پھر مالٹا کے جزیرہ میں اس وقت تک اسیر رکھا جب تک وہ دشمنانِ اسلام اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ حضرت مدنی نے اسے جملہ خبریہ فرمایا کہ آپ نے خبر دی کہ موجودہ دور میں یہ ہو رہا ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ کسی ملک میں رہنے والے اپنے اپنے عقائد اور عبادات اور مذہبی جائز رسوم پر قائم رہتے ہوئے ملکی مفاد کے لئے متحد ہو جائیں جس کا تعلق اس وطن اور ملک سے ہے۔ یہ وطنی قومیت نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری اور فطری ہے اور اس کا تعلق ایک انسان کی گلی سے لے کر شہر، ضلع، صوبہ اور سارے وطن کے ساتھ ہے وہ ایک لمحہ بھی اس تعلق سے دور نہیں ہو سکتا۔ اس تیسری قسم کی وطنی قومیت کو حضرت مدنی نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے عیسائی غاصبوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے قبول کرنے کا مشورہ دیا اور خود بھی اس پر اس وقت تک سختی سے عمل پیرا رہے جب تک کہ انگریز کے منحوس سائے سے برصغیر کو آزادی کی نعمت نہ ملی۔ اور یہ قومیت ایسی جاذب اور ناقابل فراموش ہے کہ اس کے ناممکن الحصول ہونے کے باوجود اس کا ذکر باعث تسکین سمجھا جاتا ہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان سے آنے والے افراد و خاندان اب بھی اپنے آپ کو جالندھری، انبالوی، دہلوی، امرتسری، لکھ رہے ہیں اور اسے محبوب سمجھتے ہیں۔ یعنی مسلمان کے عقیدہ اور اعمال میں اسلام کو اولین اور بنیادی مقام حاصل ہو اور گلی، محلہ، شہر، وطن کو دوسری حیثیت حاصل ہو، وہ ان سب مادی اشیاء کو تو چھوڑ سکتا ہو مگر مذہب سے دست بردار نہ ہو سکتا ہو، وہ اول مسلمان اور بعد میں ہندی، مصری، شامی وغیرہ ہو۔ چنانچہ اسی وطنی قومیت کا اظہار حضرت مولانا محمد علی جوہر نے گول میز کانفرنس لندن کے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو اپنی آخری تقریر میں فرمایا:

> "جہاں تک احکامِ خداوندی بجا لانے کا تعلق ہے میں اول بھی مسلمان ہوں دوئم بھی مسلمان ہوں اور آخر میں بھی مسلمان ہوں۔ یعنی مسلمان ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں۔ یہی حال ڈاکٹر مونجے کا ہے، احکامِ خداوندی کے بجا لانے میں ان کو پہلے ہندو ہونا چاہئے اور مجھ کو مسلمان، لیکن جہاں ہندوستان کا سوال ہے، جہاں ہندوستان کی آزادی کا سوال ہے یا جہاں ہندوستان کی فلاح و بہبود کا سوال آتا ہے میں اول بھی ہندوستانی ہوں، دوئم بھی ہندوستانی ہوں اور آخر میں بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں۔ میں دو برابر کے

دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جو ہم مرکز نہیں"۔

یہاں اتنا یاد رکھیں کہ مولانا محمد علی کی وفات اسی لندن میں جنوری ۱۹۳۱ء کو ہوئی اور بیت المقدس میں انبیاء علیہم السلام کے قدموں میں خلدِ آشیاں ہوئے۔ جناب ڈاکٹر صاحب! اب آپ کا فتویٰ مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ کے بارہ میں کیا ہوگا؟

اسی متحدہ قومیت کی تشریح خود علامہ اقبال نے کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموسِ وطن کے لئے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جبکہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کے بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔" (مضامین اقبال مطبوعہ احمدیہ پریس حیدر آباد دکن)

اس سے زیادہ وضاحت علامہ مرحوم نے اپنی وفات سے صرف پانچ ہفتے پہلے مارچ ۱۹۳۸ء میں یوں فرمائی:

"ہزاروں لاکھوں برس سے قومیں ملکوں سے وابستہ رہی ہیں اور ہم سب ہندوستانی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم دنیا کے اس حصے میں بستے ہیں جسے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ اسی طرح چینی' عرب' جاپانی' ایرانی سب اپنے ملکوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ مادرِ وطن کا تعرف صرف ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور یہ اسلام کے خلاف نہیں ہے دوسرے لفظوں میں ہر شخص فطری طور پر اپنے زادِبوم سے محبت کرتا ہے اور اس کے لئے اپنے مقدور بھر قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے۔" (ملت اور وطن' مرتبہ عبداللہ انور بیگ' ص ۱۹)

علامہ اپنے اسی وطن کو آزادی کی نعمت سے سرفراز ہونے کی تڑپ کا اظہار یوں فرما رہے ہیں۔

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے را گذر نیست

یعنی ہندوستان میں بسنے والے لوگوں کی غلامی کی رات اس قدر طویل ہو گئی ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی' نہ ابھی (۱۹۳۸ء) تک کوئی آثار نمودار ہوتے ہیں کہ صبح ہونے کی امید ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے آزادی کا سورج اس سرزمین پر طلوع کرنے سے گریز کر رہا ہے۔

اپنے اس فکر اور دردِ دل کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے "ہندی" کا کلمہ استعمال کیا جس کی نسبت وطن کی طرف ہے۔ آپ کی یہ نظم اسی ارمغانِ حجاز میں شائع ہوئی ہے جس میں

"بو لہبی" کا ذکر ہے۔ علامہ نے وطن سے بڑھ کر اپنے "برہمن زادہ" ہونے پر بھی فخر فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمے بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

ارمغانِ حجاز کے ان اشعار کو پڑھنے والے یقیناً حیران ہوں گے کہ جن بتوں کو توڑنے کا ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا ہے خود ان بتوں کو اجاگر کر رہے ہیں۔ اس حیرانی کو دور کرنے اور حقیقت سے باخبر ہونے کے لئے نوائے وقت کا وہ مقالہ پیش کر دیا جاتا ہے جو ۱۹ اپریل ۱۹۷۷ء کے پرچہ میں بعنوان "یہ علامہ اقبال کا سال ہے" شائع ہوا۔

"سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک ایسا عظیم المرتبہ اور عالمگیر شہرت رکھنے والا شاعر اور فلسفی جس کی تعلیم وطنیت اور ذات پات کی تقسیم سے بالاتر تھی ایک محدود خطے کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور مظلومیت کی داستان سن کر تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اقبال کے ذہن کا حقیقی اور پختہ رنگ وہی تھا جو آخری زمانے میں نظر آتا ہے یعنی وہ جغرافیائی حدود اور قومی و نسلی بتوں کو توڑ کر ایک عالمگیر برادری قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے وہ جو کچھ کہتے تھے اس کی حیثیت محض تجربے کی سی تھی۔ ان تجربات اور نظریات میں بعض تو ایسے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے بلند معیار کے مطابق پایا اور آخر تک نبھایا اور اکثر ایسے ہیں جنہیں پست یا وقتی سمجھ کر چھوڑ دیا' لیکن کشمیر اور اہلِ کشمیر سے محبت و ہمدردی کا معاملہ کسی پہلو سے بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہ تھا۔ وہ خود کشمیری الاصل تھے' کشمیران کے آباء و اجداد کا وطن تھا' کشمیر کی محبت وطن کے لحاظ سے بھی اور وہاں کے باشندوں کی تباہی و پامالی کے لحاظ سے بھی ان کی رگ رگ میں سمائی تھی۔ اس بنا پر ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے اور ان کے حقوق و مطالبات منوانے کے لئے اپنے معجز نما کلام کا کچھ حصہ وقف رکھتے تھے۔

دراصل وطن سے محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے' اقبال نے مخالفت اس کی نہیں کی' نہ وہ وطنیت کے دشمن تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ وطن ایک مرکزِ اتحاد ہے ان تمام لوگوں کے لئے جو اس میں رہتے بستے ہیں۔ یہ وطنیت اسلام سے ٹکراتی ہے لیکن وطن اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں۔ چنانچہ اس نکتے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اگر قومیت (وطنی قومیت) کے معنی

حب الوطنی اور ناموسِ وطن کے لئے جان قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے' اس قومیت کا اسلام کے ساتھ اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں حیات بخش عنصر باقی نہ رہے"۔

(روزنامہ نوائے وقت ۱۹ اپریل ۱۹۷۷ء بعنوان "یہ علامہ اقبال کا سال ہے")

اس تحریر کا خلاصہ سادہ اور عام فہم الفاظ میں یہ ہے کہ:

"تقسیم برصغیر سے پہلے ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد کی وطنی قومیت ہندی یا ہندوستانی تھی۔ بالفاظ علامہ اقبال ع ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا ـــــ تقسیم کے بعد پاکستان میں رہنے والی تمام اقوام جن کے مذاہب مختلف بلکہ متباین ہیں وہ پاکستانی قومیت کا حصہ ہیں' سب کی بین الاقوامی شناخت پاکستانی ہے جبکہ ہندوستان میں رہنے والوں کی قومیت ہندوستانی ہے"۔

یہی بنیادی اصول قائداعظم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں فرمایا۔ جسے آپ نے میثاق بابت فروری ۱۹۸۸ء کے ص ۲۲ پر قائداعظم کی انگریزی کے ترجمہ کی صورت میں فرمایا:-

"بہت جلد (اس ملک میں) سیاسی اعتبار سے نہ کوئی مسلمان مسلمان رہے گا اور نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا۔ مذہبی اعتبار سے نہیں' اس لئے کہ مذہب تو افراد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے"۔

اگرچہ آپ ہی کے الفاظ میں:

"ورنہ غلام احمد پرویز جیسے عاشق قائداعظم کو بھی یہ ماننا پڑا ہے کہ قائداعظم کے اعصاب اس وقت کچھ جواب دے گئے تھے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد حالات کا ایسا دباؤ اور اتنی مشکلات تھیں کہ ان کے زیرِ اثر یہ جملے ان کے قلم سے یا ان کی زبان سے نکل گئے" (رسالہ مذکور ص ۲۳)

جناب کی طرح احقر بھی اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح راست گو انسان تھے۔ ان کی رائے سے اختلاف تو ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے دل میں کچھ اور ہو اور زبان پر کچھ ہو۔ جو بات انہوں نے بہتر سمجھی وہ فرما دی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک عظیم ملک کے بانی ہیں' ان کا ایک ایک حرف قوم کے لئے راہنما ہو گا۔ اس لئے انہوں نے پہلی کابینہ بناتے وقت پاکستانی مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو نئی دستوریہ پاکستان کے پہلے اجلاس کے چیئرمین مسٹر منڈل غیر مسلم کو بنایا (تجلیات عثمانی ص ۱۹۹) اور پھر پاکستان کا پہلا وزیر

خارجہ سرظفراللہ قادیانی کو مقرر کیا اور ملک کا عظیم قلمدان' قلمدانِ قانون اسی جوگندر ناتھ منڈل کے حوالے کیا اور آپ کے اختیار کردہ طریقِ کار پر بعد میں بھی عمل ہوتا رہا جیسا کہ صدر یحییٰ نے کارنیلیس عیسائی کو وزیرِ قانون مقرر کیا تھا۔ اگر عوام کے ذہن میں پاکستان کے نظامِ حکومت کا کوئی اور نقشہ تھا تو وہ ان کا اپنا خیال تھا یا تحریکِ پاکستان کے زمانہ میں بعض علماءِ کرام اور مشائخِ عظام یا لیڈرانِ قوم نے وقتی مصلحت کے لئے وہ نعرہ لگایا ہو گا۔ قائداعظم نے کسی تقریر یا بیان میں یہ نہیں فرمایا کہ: پاکستان دینی ملک ہو گا جس میں دینِ اسلام کو بالادستی حاصل ہو گی۔ احقر نے اس وقت کے تمام بیانات اور اعلانات سنے تھے' دیکھے تھے' اور وہ جوش و خروش بھی دیکھا جس کا منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مگر قائداعظم کی طرف سے کوئی ایسا واضح اعلان نہ سنا' نہ نظر آیا۔ یہ درست ہے کہ عوام الناس کے دباؤ سے متاثر ہو کر پاکستانی حکمرانوں نے وقتاً فوقتاً ایسے کمیشن اور بورڈ مقرر کئے جن کے حوالے دستورِ پاکستان کو مشرف بہ اسلام کرنے کا کام تھا مگر ان بورڈوں اور کمیشنوں کی حیثیت کیا تھی' اس کے لئے جسٹس جاوید اقبال اور سابق صدر پاکستان سکندر مرزا کی ملاقات کا حال درج ذیل ہے۔ جاوید اقبال نے فرمایا:-

"۱۹۵۸ء کے وسط میں مجھے سکندر مرزا نے کراچی طلب کیا۔ ان ایام میں معاہدۂ بغداد سے وابستہ ممالک کی ہوائی فوج کے چند سربراہ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ شہزادہ علی خان مرحوم اور کیمبٹ لاج بھی کراچی میں موجود تھے۔ سکندر مرزا نے ایک کھانے پر ان سب سے میری ملاقات کرائی۔ دوسرے روز مجھے بلوایا گیا' دراصل وہ چاہتے تھے کہ میں کسی نہ کسی صورت میں معاہدۂ بغداد سکرٹریٹ سے منسلک ہو کر بغداد چلا جاؤں۔ میں نے عرض کیا میں سات سال وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آیا ہوں اس لئے فی الحال میری خواہش پاکستان کو خیرباد کہنے کی نہیں۔ انہوں نے نہایت خلوص سے فرمایا میں تمہیں استعمال کرنا چاہتا ہوں' اگر تمہیں بغداد جانا منظور نہیں تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت حال ہی میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا ہے' اگر آپ پسند فرمائیں تو مجھے اس کے ساتھ منسلک کر دیجئے' ممکن ہے میں اس سلسلے میں کوئی کارآمد خدمت انجام دے سکوں۔ یہ سن کر مرزا سکندر ہنس پڑے اور کہنے لگے مگر وہ کمیشن تو محض دکھاوے کے لئے وجود میں لائی گئی ہے' اس کا مقصد دراصل کچھ بھی نہیں' کیونکہ نہ تو اس نے کوئی کام کرنا ہے نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے۔" (ص ذ' مئے لالہ فام مطبوعہ ۱۹۶۶ء)

میرا خیال ہے کہ اس بورڈ سے مراد تعلیماتِ اسلامیہ کا وہ بورڈ ہے جس میں جناب مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا اطہر علی صاحب اور دیگر جلیل القدر علماءِ کرام شریک تھے مگر اس بورڈ اور کمیشن نے کیا کام کیا اور اس کا انجام کیا ہوا یہ ہمیں تو معلوم نہیں' شاید آپ کو معلوم ہو۔ آخر جناب بھی تو مجلس شوریٰ کے ممبر رہے ہیں' اس مجلس شوریٰ نے یقیناً اسلامی آئین کا مشورہ دیا ہو گا یا کم از کم (خاندانی) منصوبہ بندی جیسے قانون کے تنسیخ کی رائے دی ہو گی مگر اس کا اثر کیا ہوا یہ آپ ہی جانتے ہیں۔

مندرجہ بالا مختصر سے بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں متعارف اور متواتر اسلام کا نفاذ نہیں ہو سکتا' نہ یہ اس معنیٰ میں دینی یا مذہبی ملک ہے' نہ اس کا لوگوں سے ذمہ داران حضرات نے وعدہ کیا تھا' کیونکہ بقول آپ کے پاکستان بنانے والی جماعت مسلم لیگ:

"ہرگز مذہبی اور احیائی جماعت نہیں تھی بلکہ سیکولر مزاج کی تنظیم تھی' یہی وجہ ہے کہ اس میں کمیونسٹ بھی شامل تھے اور دہریے بھی' اور صرف شیعہ اور سنی ہی نہیں' آغا خانی بھی شریک تھے اور قادیانی بھی!" (میثاق اکتوبر ۹۲ء)

اس قدر وضاحت کے باوجود مولانا محمد اسماعیل ذبیح کا یہ واویلا کہ ہم کارکنانِ تحریک پاکستان اب شرمندہ ہیں' بے محل معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے مطالعہ کے لئے اس مضمون کا عکس ارسال ہے۔

جناب ڈاکٹر صاحب! آپ نے ان ہی چند سطروں میں علامہ اقبال کا سہارا لے کر حضرت مدنی پر سخت طنز کیا ہے کہ آپ نے جامہ تو بدل دیا مگر قد وہی تھا جسے علامہ اقبال کی خداداد فراست نے پہچان لیا۔ یہ بھی علامہ اقبال پر آپ نے ایک ظلم کیا ہے۔ انہوں نے جو کہا تھا اس سے رجوع کر لیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ تحریر کرتے وقت اپنے مرشد ابوالاعلیٰ مودودی کی وہ عینک لگا رکھی تھی جس سے مودودی صاحب نے ۱۹۴۳ء میں پنڈت نذر شاہ کاشمیری کا سہارا لے کر حضرت مدنی کے خلاف لب کشائی کی تھی جس کا جواب عبدالماجد دریا بادی نے "صدق" میں دیا تھا اور وہ ساری روداد ایک سال پہلے "براءۃ المحدث عن افتراء المحدث" کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔ حضرت مدنیؒ کو جو جامہ ان کے مرشد اور راہنما حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے پہنایا تھا وہی جامہ اور لباس آپ کے زیب تن رہا۔ مدینہ منورہ' اسارتِ مالٹا' خالق دینا ہال کراچی' مراد آباد' احمد آباد کی جیلوں میں وہی لباس زیب تن رہا' دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی مسند پر' لاکھوں مسلمانوں کی روحانی راہ نمائی کی حالت میں بھی وہی جامہ زیب تن رہا۔ حتیٰ کہ اسی جامہ میں ملبوس ۱۹۵۷ء میں آپ اپنے شیخ کے قدموں میں جا پہنچے۔ شاید آپ کو دارالعلوم دیوبند جانے کی سعادت میسر نہیں ہوئی' بانیٔ دار العلوم دیوبند مولانا

محمد قاسم کے قدموں میں شیخ الہند آرام فرما ہیں اور شیخ الہند کے قدموں میں حضرت مدنی آرام فرما ہیں' رحمتہ اللہ علیہم۔

خط کافی طویل ہو گیا ہے۔ مگر اس کی طوالت کا اصلی محرک آپ کے بے وقت وہ چند جملے ہیں جو آپ نے شیخ العرب والعجم حضرت مدنیؒ کے خلاف یوں کہے جیسے کوئی عمداً اپنے ذاتی معاند پر تیر برساتا ہو۔ اس لئے ان حملوں کے دفاع میں احقر کی تحریر میں کچھ بے احتیاطی اور جذباتیت بھی آگئی ہے' مگر بقول آپ کے:

"جب مولانا مودودی مرحوم نے خود نہ صرف یہ کہ اپنے جملہ معاصرین پر شدید تنقیدیں کیں بلکہ ع "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں" کے مصداق اسلاف کو بھی نہ چھوڑا اور جملہ مجددین و مصلحینِ امت کے علاوہ صحابہ کرامؓ پر بھی جارحانہ تنقیدیں کیں' حتیٰ کہ انبیاءِ کرام (علیہم السلام) کے بارے میں بھی بے باکانہ طرزِ گفتگو سے احتراز نہ کیا تو آخر انہیں کونسا تقدس حاصل ہے جس کا اس درجہ تحفظ لازمی ہے"۔ (میثاق فروری ۱۹۸۸ء' ص ۲۲)

اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ تقریباً ڈیڑھ سو سالہ تحریکِ آزادی میں مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) تک کون پہنچا اور ابولہب سے کس کا رشتہ استوار ہوا۔ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا

مخلص قاضی زاہد الحسینی
مدنی روڈ۔ اٹک شہر (از بسترِ علالت)

وضاحت از امیر تنظیم اسلامی

حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی مدظلہٗ کی مندرجہ بالا تحریر پڑھتے ہی راقم نے یہ فیصلہ تو فوراً کرلیا تھا کہ اسے لازماً شائع کیا جائے اس لئے کہ اس میں مسئلہ مختلف فیہ پر بحث کے علاوہ بہت سا دوسرا قیمتی معلوماتی مواد موجود ہے جس سے خود میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس معاملے میں راقم بہت متردّد رہا کہ اس پر کوئی جوابی وضاحت بھی پیش کی جائے یا نہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے مسائل میں بحث و گفتگو سے بسا اوقات معاملہ بجائے سلجھنے کے مزید الجھ جاتا ہے۔ تاہم بہت غور و خوض کے بعد دل نے یہی رائے دی کہ مختصر وضاحت پیش کردی جائے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اسے باہمی مفاہمت' حسن ظن اور خیر سگالی کا ذریعہ بنائے' آمین!

اس ضمن میں سب سے پہلے تو میں حضرت قاضی صاحب کے بارے میں اپنے ان دو قلبی تاثرات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ------ اولاً: اِس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں "بسترِ علالت" سے اتنی مفصل تحریر جس میں متعدد دور دراز کے حوالے بھی موجود ہیں ان کے استحضارِ علمی پر مستزاد مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ سے ان کے تعلقِ قلبی و روحانی ہی کا کرشمہ ہو سکتی ہے۔ (مولانا مدنیؒ کے ساتھ ان کے حلقہ بگوش حضرات کے والہانہ قلبی لگاؤ اور جوشِ محبت و عقیدت کا ایک منظر جو میں نے آج سے بائیس تیئیس سال قبل غالباً 71ء میں مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم کی مجلس میں رنگ محل لاہور میں واقع جمعیت علماء اسلام کے دفتر میں دیکھا تھا اسے آج تک نہیں بھول سکا۔ اس محفل میں کسی معاملے میں جیسے ہی حضرت مدنیؒ کا ذکر آیا اچانک ایک نہایت معمر اور سفید ریش نورانی چہرے والے بزرگ نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔) ثانیاً: اس امر سے کہ قاضی صاحب 74ء سے "میثاق" کا بالالتزام مطالعہ کر رہے ہیں خوشی بھی ہوئی اور ایک پہلو سے اطمینان بھی حاصل ہوا۔ خوشی اس پر کہ قاضی صاحب نے راقم اور "میثاق" کو اس درجہ قابلِ اعتناء سمجھا اور اطمینان اس لئے کہ اگر اس طویل عرصے کے دوران قاضی صاحب کو "میثاق" میں کوئی بڑی قابل گرفت چیز نظر نہ آئی تو یہ میرے نزدیک ایک بڑی سند ہے جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

وضاحت کے ضمن میں اولاً -------- میں اس سے نہ صرف اعلانِ براءت کرتا ہوں' بلکہ اس پر شدید احتجاج بھی کرتا ہوں کہ قاضی صاحب کے خیال میں میرے دل میں مولانا مدنیؒ سے کوئی "بغض" ہے اور اس سوءِ ظن پر اگر قاضی صاحب نے اللہ تعالیٰ سے استغفار اور مجھ سے معذرت نہ کی تو میں قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں استغاثے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ "من آنم کہ من دانم" کے مصداق میں جانتا ہوں کہ میرے دل پر مولانا مدنیؒ کے سیاسی موقف سے اختلاف کے باوجود ان کے تقویٰ و تدیّن' ان کے خلوص و اخلاص' اور سب سے بڑھ کر ان کے مجاہدانہ کردار کی عظمت کا گہرا نقش قائم ہے۔ اور اس پر مستزاد میرے دل میں ان کے ساتھ ایک خصوصی محبت اس بناء پر بھی موجود ہے کہ وہ مالٹا میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیقِ زنداں ہی نہیں خادمِ خاص رہے جنہیں میں چودھویں صدی ہجری کا مجددِ اعظم سمجھتا ہوں۔ مزید برآں میں اس پر بھی

احتجاج کرتا ہوں کہ میرے ایک لفظ "مہمل" کو حضرت قاضی صاحب نے "بہانہ بنایا" ----- اور "مغالطہ دیا" ----- اور "جامہ تو بدل دیا مگر قد وہی تھا" وغیرہ کے معنی پہنا دیئے حالانکہ یہ مفہوم میرے حاشیۂ خیال میں بھی موجود نہیں تھا۔ اپنے قول کی توجیہ تو میں بعد کروں گا' سرِدست اس سے بھی صرف اعلانِ براءت کر رہا ہوں۔

ثانیاً ----- میں قاضی صاحب محترم اور دوسرے تمام کرم فرماؤں کو یقین دلاتا ہوں کہ: **"اُذْکُرُوا مَوتاکم بِالخیر"** والی حدیث بحمد اللہ ہمیشہ میرے پیش نظر رہتی ہے اور میں اللہ کے فضل و کرم سے نہ صرف یہ کہ دوسروں کو اس کی تلقین کرتا ہوں بلکہ خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں اور ہرگز: **"وَ تَنسَوْنَ اَنْفُسَکُم"** کا مصداق نہیں ہوں' البتہ بحمد اللہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی انسان کو "معصوم" نہیں سمجھتا۔ اس بناء پر بڑی سے بڑی شخصیت اور محبوب سے محبوب انسان سے بھی "اختلاف" کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ چنانچہ اس ضمن میں میری جس تحریر کا اقتباس قاضی صاحب نے اپنی تحریر کے آغاز میں درج کیا ہے اس میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں کہ: "یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ بزرگوں کہ معبود بنالیں اور انہیں تنقید سے بالاتر سمجھیں' ان پر تنقید کرنا کوئی حرام کام نہیں!" تاہم اس معاملے میں اس توازن کی شدید ضرورت ہے کہ کسی بڑی شخصیت کی کسی ایک یا چند آراء سے اختلاف کی بناء پر اس کے جملہ محاسن کا انکار نہ کردیا جائے اور اس کی ہر اعتبار سے نفی نہ کردی جائے۔ اور بدقسمتی سے یہی توازن ہمارے یہاں بالعموم مفقود ہے۔ چنانچہ یا تو حدیث نبویؐ کے الفاظ: **"حُبُّکَ الشَّیءَ یُعمِیکَ وَیُصِمّ"** کے مصداق اندھی محبت و عقیدت کی روش اختیار کرلی جاتی ہے جس کی بناء پر اختلاف بھی لازماً "بغض" قرار پاتا ہے یا پھر بغض و عناد کی بناء پر ہر خیر اور خوبی کا انکار کردیا جاتا ہے۔

میں تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ بحمد اللہ مجھے اللہ نے توازن کے اس کمیاب وصف سے نوازا ہے۔ چنانچہ اوائل عمر ہی سے میرا معاملہ یہ رہا ہے کہ نہ کسی کی محبت و عقیدت مجھے اندھا بناسکتی ہے' نہ کسی سے اختلاف مجھے اس کے محاسن و مکارم کا منکر بنا سکتا ہے۔ چنانچہ تیئس چوبیس برس کی عمر میں جبکہ میں جماعت اسلامی کا فعال کارکن (اور منٹگمری کی جماعت کا امیر) تھا میں نے مولانا مدنیؒ ہی کی خودنوشت سوانح

"نقشِ حیات" پر مولانا مودودی مرحوم کی تنقید سے شدید اختلاف کیا تھا اور اس کا برملا اظہار بھی جماعت کے ارکان کے اجتماع میں کردیا تھا۔ (بلکہ اسے اُس وقت شدّتِ جذبات میں "علمی خیانت" سے تعبیر کیا تھا۔) اسی طرح اس کے باوجود کہ میں علامہ اقبال کو عہدِ حاضر میں فکرِ اسلامی کا مجدد سمجھتا ہوں ان کے نام کے ساتھ صرف وہ لفظ استعمال کرتا ہوں جو اپنے والد ماجد کے لئے کرتا ہوں یعنی "مرحوم" ------ اس لئے کہ فکر کی انتہائی بلندی اور فہم کی انتہائی گہرائی کے باوجود علامہ مرحوم کے عمل کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ جبکہ دوسری جانب مولانا مدنیؒ کے سیاسی موقف سے شدید اختلاف کے باوجود میں ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ "رحمتہ اللہ علیہ" کے الفاظ استعمال کرتا ہوں اس لئے کہ وہ ایک بہت بڑے عالمِ دین اور متقی و متدیّن انسان تھے۔

اسی طرح' بحمداللہ' فرقہ پرستی یا تشتّت و افتراق سے میرے مزاج کو صرف تباین اور تضاد کی نسبت حاصل ہے اور خاص طور پر تحریک پاکستان کے زمانے میں جو اختلافِ رائے اسلامیانِ ہند کے قائدین کے مابین ہوا تھا اس کی خلیج کو پاٹنے اور قلوب و اذہان سے اس کی تلخیوں کے اثرات کو دور کرنے کے ضمن میں میری مساعی کے گواہ تو یومِ اقبال کے عظیم جلسے اور تنظیمِ کارکنانِ تحریکِ پاکستان کے متعدد اجتماعات ہیں! ------ بہرحال یہ سب بطور اظہارِ حقیقت اور تحدیثِ نعمت ہے' ورنہ مجھے اس پر کسی سے نہ ستائش درکار ہے نہ تحسین!

ثالثاً ------ جہاں تک قومیت کے ان تین مختلف مفہوموں کا تعلق ہے جن کی وضاحت حضرت قاضی صاحب نے باحسنِ وجوہ کی ہے' ان کے ضمن میں کسی اختلاف کی گنجائش ہے ہی نہیں کہ علامہ اقبال مرحوم یا مولانا محمد علی جوہرؒ کی گواہیوں کی ضرورت ہو۔ خود راقم نے اب سے لگ بھگ بیس سال قبل اس ضمن میں جو بات لکھی تھی وہ غایت اختصار کے باوصف پوری طرح کفایت کرتی ہے یعنی: "برصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے تو اس کے لئے وجہِ جواز موجود تھی۔ چنانچہ جمعیت علماء ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد

بریلوی رحمتہ اللہ علیہ مسلمانانِ پنجاب کو سکھا شاہی سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے" (تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر صفحہ 30) لیکن اصل سوال یہ ہے کہ جب مولانا مدنیؒ نے خواتین ہال پل بنگش دہلی کے جلسے میں یہ بات فرمائی تو یہ اسلوب خبریہ تھا یا انشائیہ؟ اور خاص طور پر یہ کہ قاضی صاحب جو یہ فرما رہے ہیں کہ "حضرت مدنیؒ کے دونوں اقوال میں تعارض نہیں بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں!" تو آیا اس تقریر میں یہ مبینہ "دونوں اقوال" موجود تھے بھی یا نہیں؟ جہاں تک راقم کو معلوم ہے اس تقریر میں تو صرف ایک ہی بات بیان ہوئی تھی' دوسری بات تو حضرت قاضی صاحب کی اپنی توجیہ ہے نہ کہ حضرت مدنیؒ کا قول! اگر محترم قاضی صاحب کے پاس حضرت مدنیؒ کی پوری تقریر کا متن موجود ہے جس میں قومیت کے تینوں یا دونوں مفہوموں کی وہ ساری تفصیل موجود ہو تو راقم غیر مشروط طور پر اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے علیٰ رؤس الاشہاد معافی مانگ لے گا!

رہا یہ سوال کہ علامہ اقبال کی گرفت پر مولانا مدنیؒ نے وہ موقف کیوں اختیار کیا جو میرے نزدیک "مہمل" ہے تو اس کی توجیہ وہی ہے جو قائداعظم کے 11 اگست 47ء والے قول کی ان کے ایک غالی عقیدت مند غلام احمد پرویز نے کی ہے جس کا ذکر اور اقتباس حسنِ اتفاق سے قاضی صاحب کی تحریر میں موجود ہے۔ تو اگرچہ راقم کے نزدیک قائداعظم کے اس قول کی توجیہ مختلف ہے (جو راقم نے تفصیل کے ساتھ اپنی تالیف "استحکام پاکستان" میں بیان کی ہے) تاہم یہ بات جو پرویز صاحب نے کہی ہے اپنی جگہ درست ہے کہ بڑے سے بڑے انسان سے بھی بعض اوقات ذہنی اور اعصابی دباؤ کے تحت ایسے افعال و اقوال صادر ہوسکتے ہیں جو نارمل حالات میں ان کے بالکل شایانِ شان نہ ہوں۔ لیکن ایسی باتوں کو بس ایک منفرد واقعہ کے طور پر تسلیم کرنے پر اکتفا کرنی چاہئے اور ان کے پوسٹ مارٹم کے ذریعے ان کی پشت پر کارفرما "نیتوں" کا تعین نہیں کرنا چاہئے!

رہی یہ بات کہ حضرت قاضی صاحب قائداعظم کے 11 اگست 47ء کے محولہ بالا الفاظ کو "محکم" قرار دے کر ان کے قبل از تقسیم کے جملہ اعلانات کی نفی فرما رہے ہیں تو یہ ان کی حضرت مدنیؒ اور مولانا آزاد مرحوم کے سیاسی موقف کے ساتھ "وفاداری بشرطِ استواری" کی مظہر ہے۔ راقم کو قاضی صاحب سمیت ان جملہ اکابر کی عظمت کے اعتراف

کے باوجود اس سے شدید اختلاف ہے! لیکن اس معاملے میں ہمیں انگریزی محاورے "We agree to differ" یعنی "ہمارا اس پر اتفاق ہے کہ ہمیں اختلاف کا حق حاصل ہے!" پر عمل پیرا رہنا چاہئے اور ایک دوسرے کی نیتوں پر حملہ کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے!

آخر میں عرض ہے کہ حضرت قاضی صاحب کی اس تحریر سے علامہ اقبال کے جو غیر مطبوعہ یا "منسوخ" اشعار علم میں آئے اور مولوی مظہرالدین شیرکوٹی کی شخصیت سے تعارف ہوا' یہ سب میرے علم میں اضافہ ہے اور اس تحریر کی اشاعت قارئین "میثاق" کی معلومات میں بھی اضافے کا ذریعہ بنے گی (اگر ان چیزوں کی تفصیل کی طرح قاضی صاحب اس معاملے کی بھی کسی قدر تشریح کردیتے کہ 1943ء میں میرے "مرشد" مولانا مودودی مرحوم نے حضرت مدنیؒ کے بارے میں کیا "لب کشائی کی تھی" تو اس سے بھی میرے علم میں اضافہ ہوتا) ---- اور سب سے آخر میں یہ اعتراف کہ راقم نے واقعتاً کبھی "عروض و قوافی" کا علم حاصل نہیں کیا۔ نہ ہی زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں راقم نے کبھی شعرگوئی کی کوئی کوشش کی! البتہ راقم کے علم میں ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں شعراء کی عمومی مذمت وارد ہوئی ہے وہاں استثناء بھی مذکور ہے اور حدیثِ نبویؐ میں تو بعض اشعار کو سراپا حکمت قرار دیا گیا ہے۔

رہی یہ بات کہ علامہ اقبال وسیع القلب اور عالی ظرف تھے یا صرف حقیقت پسند' ---- اور بنیادی طور پر خالص جذباتی انسان ہونے کے ساتھ غنیمت ہے کہ بس "ضِدی" نہ تھے! یا "عقل و خرد" کی جملہ گتھیاں سلجھانے کے بعد "صاحب جنوں" ہونے کے آرزومند تھے تو اس موضوع پر گفتگو لاحاصل ہے' اس لئے کہ "عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید!" فقط!

بقیہ: تذکرہ و تبصرہ

کہ تمہارا اپنا عمل بھی درست ہو' یہ نہ ہو کہ دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت! "وَقُلْ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" ---- اور پھر یہ کہ عاجزی اور انکساری کا اظہار اس طور پر ہونا چاہئے کہ تم کہو کہ میں بھی ایک عام مسلمان ہوں' میری کوئی نمایاں اور امتیازی حیثیت نہیں ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ جان لو نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتے' لہٰذا "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" تمہیں مدافعت کرنی ہوگی اس انداز سے جو بہترین ہو۔ صبر و تحمل کا

مظاہرہ کرنا ہوگا' لوگ اگر تمہیں گالیاں دیں تو تم دعائیں دو' لوگ پتھراؤ کریں تو تم پھول پیش کرو۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ "فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ" کہ آج جو شخص تمہارے خون کا پیاسا ہے ہوسکتا ہے کل وہی تمہارا انتہائی گرم جوش حامی بن جائے' تمہارا جاں نثار بن جائے۔ "وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ" لیکن یہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا مگر انہی کو جو صبر کرسکیں' اور اس مقام کو وہی پاسکیں گے جو بڑے نصیب والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسری آیت جس کی طرف میں خصوصی طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ سورۃ النساء کی ہے۔ پورے بارہ برس جو حکم صحابہ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی توثیق فرمائی: "أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ" ایک وقت وہ تھا جب مسلمانوں کو حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو' روکے رکھو' کوئی جوابی کارروائی نہ ہو' اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اپنے اندر نظم و ضبط کی عادت پختہ پیدا کرو' اپنی شخصیتوں اور کردار کے اندر پختگی کا رنگ نمایاں کرو! پھر منظم ہوکر ایک جمعیت کی شکل اختیار کرو' پھر ایک وقت آئے گا جب اجازت ہوجائے گی' میدان میں آکر للکارنے کا موقعہ بھی آجائے گا' اذنِ قتال بھی مل جائے گا۔ لیکن اس وقت تک تمہیں صبرِ محض ہی کے مرحلے سے گزرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جذبہ بھی عطا فرمائے لیکن اس جذبے کے صحیح استعمال کے لئے صحیح نہج اور طریقِ کار کا فہم و شعور بھی عطا فرمائے (آمین)

جن حضرات کے لیے

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورۂ ترجمہ قرآن

کے آڈیو کیسٹ کا مکمل سیٹ یکمشت خریدنا ممکن نہ ہو اور وہ اقساط کی صورت میں یہ سیٹ حاصل کرنا چاہیں وہ درج ذیل پتے پر خط لکھ کر تفصیلات طلب کریں

محمد عمر خان (قصر عبداللہ) ۸۴/۸/۱۰ کہکشاں اسٹریٹ ۵ نیو گلگشت کالونی، ملتان

رفقائے تنظیم اسلامی اور معاونین تحریک خلافت کے لئے

اطلاع

تحریک خلافت پاکستان کے پہلے کل پاکستان کنونشن منعقدہ یکم مئی 93ء کے بعد تنظیم اسلامی پاکستان اور تحریک خلافت پاکستان کے تنظیمی معاملات کے سلسلے میں درج ذیل فیصلے کئے گئے ہیں:

- مختار حسین فاروقی صاحب کو ناظم تحریک خلافت پاکستان کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔ موصوف فی الحال تنظیم اسلامی حلقہ جنوبی پنجاب کے ناظم کی حیثیت سے بھی کام کریں گے اور تحریک خلافت کی پیش رفت کے سلسلہ میں حلقہ جنوبی پنجاب پر خصوصی توجہ دیں گے۔
- عبدالرزاق صاحب کو سیکرٹری تحریک خلافت پاکستان مقرر کیا گیا ہے۔ تحریک خلافت پاکستان کا مرکزی دفتر خلافت بلڈنگ 4 اے مزنگ روڈ لاہور پر کام کرتا رہے گا۔ موصوف تنظیم اسلامی حلقہ لاہور کے ناظم کی حیثیت سے بھی کام کریں گے۔
- ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کو ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان مقرر کیا گیا ہے۔ موصوف ناظم تربیت کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہیں گے۔

اسرار احمد، عفی عنہ

امیر تنظیم اسلامی پاکستان و داعی تحریک خلافت پاکستان

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REGD NO. L 7360
VOL. 42 NO. 45
May 1993